چاکرِ اعظم

از

سردار خان گشکوری

مترجم

عبدُالغفار ندیم

بلوچی اکیڈمی

مکران ہاؤس - کوئٹہ

چاکرِ اعظم

از

سردار خان گشکوری

مترجم

عبدُالغفار ندیم

بلوچی اکیڈمی

مکران ہاؤس - کوئٹہ

جملہ حقوق محفوظ

طباعت اوّل ——— ۱۹۸۸ء
طابع ——— بلوچی اکیڈمی
اہتمام ——— سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ
قیمت مجلد ——— ۹۰۰۰۰ روپے
" غیر مجلد ——— ۶۰۰۰۰ روپے

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام ادارہ سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ جناح روڈ کوئٹہ نے کیا۔

فہرست

	عرضِ مترجم	۳
باب ۱	بابل سے بلوچستان تک	۷
باب ۲	بلوچ نسل کا کردار	۷۲
باب ۳	بلوچِ اعظم	۱۰۹

عرضِ مترجم

کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہے اور مجھے اس امر کا بلا تامل اعتراف ہے کہ میں اس فن سے قطعاً نابلد ہوں اور فضل کتب کی حیثیت کا بھی حامل نہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ جب مترجم دونوں زبانوں میں سے کسی پر عبور نہ رکھتا ہو تو معاملہ زیادہ مشکل اور تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتا ہے مگر بلوچی اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے فیصلے یا بالفاظِ دیگر حوصلہ افزائی کی بنا پر مجھے یہ فریضہ طوعاً و کرہاً انجام دینا ہی پڑا۔ گو کہ بلوچ ادبا اور دانشوروں میں اس فن میں نہایت تجربہ کار اور ماہرین فن موجود ہیں مگر اسے کیا کیا جائے کہ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند کے مصداق انگریزی سے اردو میں کسی کتاب کے ترجمے کا بلوچی اکیڈیمی نے فریضہ مجھے سونپ کر مجھے اپنے اولین تجربہ جانکاہ میں مبتلا کر دیا اگر میرے رفقائے کار اور بلوچی اکیڈیمی کے فاضل اراکین کا مفید تعاون حاصل نہ ہوتا تو یقیناً میں اس کارگراں کو تکمیل تک پہنچانے کی جسارت کرنے کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اکیڈیمی کی مجلسِ عاملہ نے بلوچوں سے متعلق کئی کتابوں کا جائزہ لیا تاکہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اور ترجمہ کر کے اسے شائع کرایا جائے۔ نظرِ انتخاب اس کتاب پر اس لئے پڑی کہ اس میں بلوچوں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہر نوع اور ہر قسم کا تعارفی مواد موجود ہے جس سے قومی سطح پر بلوچ متعارف ہو سکتے ہیں اور اردو قارئین بلوچوں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ازمنہ قدیم سے لے کر زمانہ جدید تک بلوچوں کی نسلی، قومی، عوامی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، جغرافیائی، مدنی، اور بدوی زندگی، کردار،

اور ضابطہ اخلاق کے علاوہ بلوچوں کے ہیرو اور بطلِ جلیل میر چاکر کی زندگی اور اس کے عہد کے جامع حالات، کوائف، تاریخ، روایات اور شعری خزانوں داستانوں کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔ گویا ازمنہ قدیم سے زمانہ جدید تک بلوچوں کے حالات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مگر ازمنہ وسطیٰ کے بلوچ زعما اور ہستیوں کے سوانح اور ان کے کارناموں پر عموماً اور میر چاکر کے عہد کے تاریخی، معاشرتی، جغرافیائی، نفسیاتی، معاشی، قبائلی، اخلاقی، نسلی، اور روایتی پس منظر کی خصوصاً تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ یہ کتاب اردو قارئین کے لئے بلوچوں کو مجموعی طور پر سمجھنے کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی۔ کسی بلوچ دانشور اور مورخ کی یہ پہلی کاوش ہے جس میں اتنے مختلف موضوعات پر ایک ہی کتاب میں اتنا وسیع و جامع مواد جمع کیا گیا ہے۔

فاضل مصنف کے طرزِ استدلال، نقطہائے نظر اور خیالات سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان کی کاوش کے قابل قدر ہونے اور ان کے خلوص نیت پر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ میرے خیال میں مصنف نے بلوچ تاریخ اور میر چاکر کی سوانح عمری کی عمارت تعمیر کرنے میں بنیاد فراہم کر دی ہے اور اس کام کو تحقیق و تدقیق کے سائنسی طریق ہائے کار کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ فاضل مصنف کے نظریات و خیالات اور تاریخی تجزیات میں مجھے افراط و تفریط کا احساس ہوتا ہے۔ مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر مورخ، ادیب اور دانشور کی تحریر اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کا اسلوب، اندازِ فکر اور نظریات و خیالات اس کی شخصیت کے پرتو ہوتے ہیں اور میں یہاں یہ لکھنے میں بھی باک محسوس نہیں کرتا کہ ان کے کئی خیالات و نظریات اور تاریخی تجزیوں میں میں اپنے کو متفق نہیں پاتا ہوں، مگر مترجم کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ وہ ترجمہ کرتے وقت مصنف کی تحریر کی روح کو مجروح نہ ہونے دے اور اسکے خیالات کو بعینہٖ پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر میں نے حتی الوسع

اور اپنی بساط کے مطابق یہ سعی کی ہے کہ کہ مصنف کے خیالات و نظریات، کو انہی کے انداز میں ان کی اصلی روح کے ساتھ پیش کرسکوں جس میں میں خاک کامیاب ہونے کا داعی نہیں ہوسکتا کیونکہ فاضل مصنف کی چاشنی انگریزی اور طرز نگارش اور پھر اردو زبان میں بھی میں اپنے کو کوتاہ القصور کرتا ہوں۔ اس لئے اگر ترجمے میں کوئی خامی، غلطی یا فروگذاشت ہو گئی ہو تو، تو میں بلا رد و قدح اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔ بلوچی اشعار کے انگریزی ترجمے کو اردو کے قالب میں ڈھالتے وقت ان کے اصل بلوچی متنوں کو پیش نظر رکھا گیا، کیونکہ اس کتاب میں ڈیمز کے انگریزی ترجموں کا زیادہ تر حوالہ دیا گیا تھا۔ اور ڈیمز کے انگریزی ترجموں میں خامیوں کو رفع کرنے کے لئے اصل بلوچی اشعار کو پیش نظر رکھنا ضروری تصور کیا گیا

میں آخر میں اپنے بزرگ ملک محمد پناہ صاحب مرحوم کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ترجمہ شدہ اردو مسودے پر نظر ثانی کی اور کئی خامیوں اور فروگذاشتوں کی تصحیح و درستگی کی، اور اپنی قابل قدر آراء سے نوازا۔ اس طرح کتاب کے فاضل مصنف میر سردار خان کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے بھی اپنا قیمتی وقت نکال کر اردو مسودے کو پڑھا اور خامیوں اور غلطیوں کی تصحیح کی۔ مزید براں میں محترم جناب الحاج حاجی عبدالقیوم کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے میری عدیم الفرصتی کی بناء پر پروف کو پڑھنے اور ان کی تصحیح کی پوری ذمہ داری اٹھالی اور ساتھ ساتھ کئی خامیوں اور فروگذاشتوں کو درست کرکے اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ ہونے کے قابل بنایا۔ یہ کتاب تمام مراحل طے کرنے کے بعد ایک عرصہ تک بلوچی اکیڈمی کے اور بھی بہت سے اہم مسودات کے ساتھ سرد خانے میں پڑی تھی۔ اب محترم جناب بشیر احمد بلوچ صاحب نے اسے خاص توجہ کا مستحق جانا اور بلوچی تاریخ کی ایک اہم کتاب جانتے ہوئے اسکی فوری اشاعت کا اہتمام کرکے نہ صرف مجھے ممنون بنا

بلکہ اردو دان طبقے کو ایک اہم تاریخی بلوچی دستاویز سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے ۔ اگر ترجمے میں کوئی غلطی، خامی اور فروگذاشت رہ گئی ہو تو میں ذاتی طور پر اس کے لئے معذرت خواہ ہوں ۔

عبدالغفار ندیم

کوئٹہ

بابِ اوّل

بابل سے بلوچستان تک

اُس زمانے میں، جب شمشیرِ براں، سنانِ تیز نوک اور سمندِ تیز رو کو فوقیت حاصل تھی. جنگجوئی و شجاعت ضابطۂ حیات تھا، تو بلوچی جانبازی و سرفروشی، غیض و غضب اور شہرت و عظمت کی دھاک، مشرقِ وسطیٰ کی وسعتوں میں شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ، ریاست بہ ریاست اور شہ بہ شہ دلوں پر بیٹھ چکی تھی. مرقومہ تاریخ کے آغاز پر انسان زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہوا تھا اور بنی آدم کی نتیجہ خیز پیش رفت، دریاؤں کی چند عظیم وادیوں میں محیط ہو گئی تھی. انسان قدرتی طاقتوں کے خلاف اپنی کمزور قوت اور ناقابلِ تسخیر جرأت مندی و بہادری کو اُن پر قابو پانے کی خاطر مجتمع کرتا ہوا نظر آتا ہے. پھر مذہب و فلسفہ جنم لیتے ہیں. فنونِ لطیفہ اور ادب کی تخلیق ہوتی ہے. سیاسی نظام کی تشکیلِ نو اور پیش رفت ہوتی ہے. تجارت و فنونِ غیر لطیفہ کو فروغ اور ترقی حاصل ہوتی ہے. شہر و دیہات وجود میں آتے ہیں. اور زندگی کے پیچیدہ تر اور امیر تر ہونے کے عمل کی ابتدا ہوتی ہے. اِسی دور میں بلوچوں نے بابل کے کلدانیوں کے شاہی خانوادے کی حیثیت سے قدیم مشرقِ وسطیٰ میں بے مثال عظمت اور شان و شوکت کی حامل ممتاز شخصیات کو جنم دیا. تمام اہم سامی نسلوں میں یعنی فونقیوں، عکادیوں، آرامیوں، آشوریوں اور بابلیوں میں سے، جو افریقی ساحل

کے ساتھ ساتھ میسوپوٹامیا سے لیکر بحیرۂ روم کے مغربی کنارے تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض علاقے پر قابض تھے۔ کلدانی شاخ ہی وہ واحد نسل ہے جسے تاریخ میں گراں مایہ کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا امتیاز و شرف حاصل ہے۔ کلدانی قوم کی دانشورانہ صلاحیتیں، قرونِ قدیم میں انسانی صلاحیتوں کے بلند و افضل ترین معیار کا ہم پلہ تھیں۔ انہوں نے فطرت کو مسخر کرکے انتہائی طور پر اپنا مطیع و تابع بنالیا تھا۔ انہوں نے تجارت و زراعت کو فروغ دیا، تابناک فنونِ لطیفہ کو بامِ عروج تک پہنچایا، پُرشکوہ معابد اور پُروقار و ذی شان تعمیرات کی صورت میں اپنی باقیات اِس عالمِ ہست و بود میں چھوڑیں، تہذیب و ثقافت کی پرداخت و پرورش و سرپرستی کرکے اِسے تمدن کے کمال کی حد تک لے گئے، انسانی تاریخ میں شہرۂ آفاق اور متاثر کن کارنامے انجام دیئے۔ اور وادیٔ دجلہ و فرات کو تہذیب و تمدن کا مرکز اور گہوارہ بنا ڈالا۔ ترقی و پیش رفت کے اوجِ کمال تک پہنچنے کے دو ہزار سال بعد، جب کلدانی نسل کی تقدیر پر مُہر لگ گئی، تو "زرخیز ہلال" کی وادی میں ترقی و خوشحالی تقریباً مفقود ہوگئی۔ بلوچ[1]، ازمنۂ مابعد میں تاریخ کی بیباک اور طوفانی راہوں پر چلتے ہوئے، گم گشتہ کلدانی نسل کے آخری نمائندے اور واحد یادگار کی صورت میں دیارِ غیر میں ظہور کرتے ہیں۔ انہوں نے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے۔ اور وہ تاریخ کے دریائے رواں میں کوئی تلاطم و تموج پیدا نہ کرسکے۔ اور نہ ہی ہم ان کے نام سے منسوب کوئی عظیم یادگار اور اعلیٰ شہکار دیکھ پاتے ہیں۔

۱۔ بلوچوں کی اصل نسل اور حسب و نصب کے بارے میں قارئین محمد سردار خان کی کتاب "بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ" باب اول۔ صفحات ایک تا ۲۳، ملاحظہ کریں۔

کلدانی بلوص (بلوچ) حکمرانوں کی طویل فہرست میں شہنشاہ نمرود (۲۲۵۰ ق م) شہنشاہ بلوص (۲۱۳۰ ق م) اور بنوکدنصر (۶۰۴ - ۵۶۴ ق م)، جو عربی تواریخ میں عموماً الشداد کے نام سے مشہور و معروف ہے، کے اسمائے گرامی اُس دور کے سیاسی افق پر بابل، آشوریہ اور ہمسایہ ولایتوں پر حکمرانی کرنے والی سامی اور آریائی نسلوں کی نامی گرامی ہمعصر شخصیات میں سب سے زیادہ ممتاز اور صبح کے تارے کی مانند تابندہ و درخشندہ نظر آتے ہیں۔

نمرود:

نمرود کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ "وہ خطۂ ارض پر اولین طاقتور شخصیت تھا"[1] سکتر اپنی شرح میں نمرود کے بارے میں رقمطراز ہیں: "من مانی طاقت پر منحصر فوجی ریاست کے تخیل کے خالق تھے" نمرود مقدس انجیل میں مذکورہ کوش کے فرزند تھے[2]۔ باحوص[3] (BALLHUS) کا نام دراصل برحوص ہے جس کے معنی کوص یا کوث کے لڑکے کے ہیں۔ جس کو یہودی نمرود کہتے تھے۔ کیونکہ باحوص نبرودیس (NABRDES) کہلاتا تھا جو کہ نمرودیس (NIMRODES) ہی ہے۔ مزید یہ کہ "وہ چیتے کی کھال پہنتا تھا اور ایسی رتھ پر سواری کرتا تھا جسے چیتے کھینچتے تھے۔ اِس جانور کو کلدانی اور عبرانی دونوں زبانوں میں نیمر[4] ہی کہتے تھے۔" لفظ نمرود کے اصلی معنی "آگ اٹھانے والا" یا "آتش بدست" کے ہیں۔ عہد نامۂ عتیق[5] میں اسیریا کو نمرود کا

۱۔ کتاب پیدائش باب دہم ۲۔ قدیم ملوکیت از رالینسن۔ ص۔ ۱۴۸۔

۳۔ لفظی معنی "شراب کے دیوتا" کے ہیں۔ مترجم ۴۔ اسی نام کی مناسبت سے ابھی تک ہمارے ہاں ایک قبیلہ نمرودی یا نمردی کے نام سے موجود ہے۔ اسی کو وسیع تر معنوں میں نمرودی کہا جا سکتا ہے جس کے معنی نمرود کے پیرو کا یا اس کی اولاد کے ہیں۔

۵۔ میکاہ باب ۵-۶

وطن بتایا گیا ہے۔ اسیری حکمرانوں کی اکثریت شکار کھیلنے میں اپنے شوق وجنون کی بنا پر شہرت یافتہ ہے۔ اور اسی لئے نمرود بھی اس شہرت کا حامل تھا کہ" وہ خدائے عزوجل کے نزدیک ایک طاقتور شکاری ہے۔" جنسن (JENSEN) اور جرکو (JERKU) کی رائے میں ننِ اِب جو ایک بابلی دیوتا تھا، نمرتو ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ اور نمرود سے اس کا تطابق کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کلے کا خیال ہے کہ اس نام کا صحیح تلفظ ننِ مُرتو ہے۔[1] کچھ مورخین غلط طور پر نمرود کو گِل گامُس سے خلط ملط کرتے ہیں کیونکہ دونوں کے کردار میں کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ نمرود کی داستان بنیادی طور پر بابل کی تاریخ اور اس کے آثار سے اخذ کی گئی ہے۔ مگر کلدانی ماخذوں سے اب تک اُسی طرح کا کوئی نام دریافت نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ عموماً یہی ہوتا رہتا ہے کہ ہمیشہ دیومالائی داستانیں اور کہانیاں، ایک مرکزی شخصیت کے ساتھ، اس کے ایک ہر دلعزیز ہیرو ہونے کے ناطے کی وجہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ گِل گامیش کے ساتھ بھی ایسا ہی واقع ہوا۔

گِل گامیش کا نام ہی دراصل سمیری ہے اور ایک قدیم سمیری نظم کے کچھ حصے نیفر (NIPPUR) کے مقام سے دریافت ہوئے ہیں۔ جو اس سے متعلق ہیں۔[2] اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے ۱۲۶ برس حکومت کی اور اریک کے مقام کو اپنا مرکز بنایا بعد ازاں وہ ایک دیوتا بن جاتا ہے اور موسم بہار کے سورج دیوتا کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ یقیناً ایک سمیری پولیس ہی تھا اور غیر فانی زندگی کے حصول کا خواہشمند تھا۔ جس میں اسے شرمناک طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

نمرود نے عیلام کے بادشاہ حمیاب پر حملہ کر دیا اور اسے ہلاک کر ڈالا۔

۱۔ بابلی روایات کے ماخذ صد ۲۲

۲۔ بابل و اسیریا کا مذہب از جسٹرو صد ۴۶۸

اس نے ۲۲۵۰ ق. م میں کلدانی سلطنت قائم کردی. ابتدائی دور میں اس کی سلطنت میں بابل، ایرک (موجودہ ورکا) عکّاد (سارگون اول کا شاہی شہر عکّاد) اور کالینا کے علاقے شامل تھے.

اس نے کئی شہر آباد کئے جن میں نینوا. کالح. رحوبوطار. اور رسین بہت زیادہ مشہور تھے. نمرود نے کلدانی خاندان کی پہلی سلطنت کی داغ بیل ڈال دی تھی جس پر ۱۹۷۶ ق. م تک گیارہ کلدانی بادشاہوں نے حکمرانی کی. برروسس بیان کرتا ہے کہ کلدانی خاندان کے آٹھویں بادشاہ اِلسی نے ۲۰۵۰ ق. م تک کلدیہ پر حکومت کی. نمرود کے دور میں فنونِ لطیفہ اور ادب کو فروغ دیا گیا. اور سیاسی و انتظامی ترقی کے لحاظ سے مشرقی ملوکیتوں میں اس دور کو اولین مثالی اور ممتاز حیثیت حاصل ہے. وہ شہنشاہیت کا ایک جامع و مکمل پیکر تھا. وہ ایک بے نظیر ملک الملک اور مطلق العنان شہنشاہ تھا جس پر تقدیر اتنی مہربان تھی کہ وہ ہر شے پر قدرت رکھتا تھا اور ہر چیز کو اپنی خواہش کے مطابق متبدل کرنے پر قادر تھا. وہ سب کچھ اپنی مرضی و رضا کے تابع کرنے کا خواہشمند تھا. نام و نمود، حرص و طمع اور عیش و نشاط کے بے انتہا شوق و جنون نے اسے ایک شہرۂ آفاق دیوتا کا روپ دھارنے پر مائل کر دیا۔

بلوص :

نمرود کے بعد بلوص[1] اپنے خاندان میں دوسرا طاقتور حکمران تھا. اس کا دور سنہری کارناموں کی بنا پر ممتاز ہے. انہوں نے اپنی نسل کی قدیم روایات کے عین

---

۱. رالنسن کا خیال ہے کہ اسمِ بلوچ بابل کے شہنشاہ "بلوص" سے مشتق ہے.
قدیم ملوکیت جلد اول ص ۱۶۸

مطابق امورِ حکومت انجام دیتے ہوئے بابل کے تمدن کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ انہوں نے بابل شہر میں معابد و گرجاؤں کی پرشکوہ عمارتیں تعمیر کیں۔ اس نے ہمسایہ ریاستوں اور دیگر حملہ آوروں کے حملوں کو ناکام بنا کر اپنے خاندان کے وقار و ناموس کو برقرار رکھا۔ وہ ایک مضبوط اور طاقتور حکمران تھے۔ ان کی طاقت و قوت کے بل پر ان کے تخت و تاج پر قبضہ کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور ایک شہنشاہ اور دیوتا دونوں حیثیتوں سے تاحیات ان کی عزت و تکریم اور پرستش کیجاتی رہی۔ وہ بابلی عقیدہ و مذہب اور تہذیب و ثقافت کے نگرانِ اعلیٰ، پیروکار ——— (NABU POLLASSAR) کلدانی نے اس کے خلاف معرکۂ کارزار گرم کیا اور اس سے نبرد آزما ہوا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اِکبتانہ (ECBATANA) کے سائیتھی بادشاہ سیاکسیرز (CYAXARES) یونانی نے اس کی مصیبتوں میں مزید اضافہ کیا۔ نینوا بمعہ بابل کے شمالی شہروں کے فتح کئے گئے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اس طرح آشوری سلطنت کا ذلت آمیز اور المناک زوال رونما ہوا۔ سلطنت کا مرکز ایک بار پھر بابل منتقل ہوا۔ نبو پولصار کے بعد اس کے بیٹے بنوکد نصر تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔ جنہوں نے بابل کو ایک ہمعصر دنیا میں عروس البلاد کے مرتبہ تک پہنچایا۔ انہوں نے ۶۰۴ سے لیکر ۵۶۴ ق۔م تک حکومت کی۔ اور بنی نوع انسان کی تاریخ میں زرّین اور خوشنما اوراق کے اضافے کا باعث بنے۔ انہوں نے قدیم زمانے کے عظیم ترین حکمرانوں میں شمار ہونے والے عمّوری شہنشاہ حمورابی کی حکمرانی کے بعد ایک ہزار سال کی مسلسل تباہی و بربادی اور کمزوریوں کے شکار بابل کو ایک بار پھر ایک زرّین اور شاندار دور میں داخل کر دیا۔ بنوکد نصر نے اپنے شوق و تجسّس اور بلند ہمتی و مردانگی سے شام کو مصریوں کے آہنی طوقِ غلامی سے نکال کر آزادی کے دلہن سے ہم آغوش کیا اور مبلغ کے طور پر مشہور و معروف تھے۔ شہرت و خوش بختی زندگی بھر

ان کے قدم چومتی رہی۔ تادمِ مرگ ان کی شہرت وکامرانی کی چمک دمک ماند نہ پڑی حتیٰ کہ اپنی وفات کے بعد وہ دیوتا بن کر ابھرے۔[1]

نبوکد نصر (NABUCHNAZZAR)

وہ بابل کے فرمانروا آخری کلدانی خاندان کے آخری عظیم نمائندے تھے۔ آشوری شہنشاہ اشور نی پال کی وفات کے بعد ان کی بڑی قربانیوں اور جدوجہد کے بعد حاصل کی گئی سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہوکر ٹکڑے ٹکڑے ہوتی چلی گئی۔ ان کے جانشین اِطیل علانیق (ASSUR ETIL ILANIC) کے دورِ حکومت میں سائیتھی اسوریہ میں گھس آئے اور اشوری حکمران کے علاقے میں اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اشوراطیل عیلانی کے بھائی شین شر اشکون (SIN-SAR-ISKUN) (شین شرّا ازور) SIN SARRA AZUR بروسس کے سراکوس (سراکوس) ابھی اپنے دورِ حکومت کے ساتویں سال میں داخل ہوا تھا۔ کہ بدبختی کے سیاہ بادلوں نے اس کو چاروں جانب سے اپنے نرغے میں لے لیا۔ بابل کے ولی نبوپولصار کردیا۔ ۵۸۶ ق م میں انہوں نے یروشلم پر حملہ بول دیا۔ اور یہودیوں کو گرفتار کر کے غلام بنالیا۔[2] گیارہ سال بعد جب یہودیوں نے دوسری مرتبہ علمِ بغاوت بلند کیا تو انہوں نے سارے شہر کو نذرِ آتش کر کے بھسم کردیا۔ اور یروشلم خاکستر ہوکر ایک ماتم کدہ بن گیا۔[3] ان کے عہد میں ہم کلدانیوں اور بابلیوں کو جو نسلاً ایک ہی سامی خانوادے کی دو قریبی شاخیں تصور ہوتی ہیں، آپس میں مکمل طور پر مخلوط و مربوط ہوکر شیر و شکر ہوتا دیکھتے ہیں۔ تاریخ بابل میں ان سے قبل کبھی بھی اس ملک کے باشندے اسقدر خوشحال و متمول، خوش و خرم

۱۔ شکستہ ٹکڑے۔ از کوری ص ۶۵

۲۔ JER. III. 28-30 ۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

JOSEPHUS, CONT APION, I.19; EUSEBIUS PRAP, EVANYELX.

اور مطمئن نہ تھے۔ اور نہ ہی ان پر کبھی اس سے بہتر حکومت کی گئی۔ ان کا دورِ حکومت، امن و امان، فتح و نصرت، شان و شکوہ، خوشحالی و امارت، قوت و دبدبہ، نیکوکاری و راست روی اور سخت گیری و مضبوطی میں شہرۂ عام رکھتا تھا اور عدیم النظیر تھا۔ ان کی عقابی نگاہیں، امورِ مملکت کے ہر پہلو پر جمی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور وہ ریاست کے اعلیٰ عمال کار اور عہدیداروں کی فرض شناسی، دیانت داری اور فعالیت کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا اور باقاعدہ اچھے مشاہروں کی صورت میں انکی حوصلہ افزائی و دلجوئی کر کے ان کو مکمل تحفظ فراہم کرتے تھے۔ وہ اگر ایک طرف اپنی بادشاہت کو شان و شوکت سے رونق بخش کر قائم کرتا تو دوسری طرف ممتاز اور اہل و مستحق افراد کی سرپرستی کر کے ان کی مالی کفالت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے احترام و وقار میں اضافے کا سامان بھی کرتا۔ انہوں نے ایک ماہر باغبان کی طرح جو ثمر آور درختوں کی شاخ تراشی کر کے ان کی نمو و افزائش کی خاطر ان کو سنوارتا رہتا ہے، اپنے انتظامی ڈھانچے کے بلند و بالا درخت کی غیر ضروری شاخوں اور مردہ ٹہنیوں کی تراش خراش کر کے اسے پُر رونق اور متاثر بنانے کے لئے، اس میں زندگی کی نئی روح ڈال دی تھی۔

بابل میں تمدن کا عروج

"ہلالِ زرخیز"[1] کی تاریخ میں قدیم زمانے سے مختلف نسلوں کے عروج و زوال کی بوقلمونی و رنگا رنگ داستانوں کا امتزاج ہے۔ بابل کی تاریخ میں زمانۂ ماقبل تاریخ سلو[2] کی خاندان کے دور تک آثار قدیمہ کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ وادی دجلہ و فرات سلطنتِ بابل۔ مترجم۔

۲۔ اس خاندان نے ۳۱۲ تا ۶۵ ق۔م تک شام پر حکمرانی کی۔ اور اس خاندان کی حکومت کا بانی سکندر اعظم کا ایک سپہ سالار اور جرنیل سلیوکس اول تھا۔ مترجم۔

سب سے پہلے زمانۂ ماقبل تاریخ کا دور آتا ہے جو ۳۰۰۰ ق۔م تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا دور سومیری[1] خاندان کے عہد کا ابتدائی دور ہے جو ۳۰۰۰ ق۔م سے لیکر قریباً ۲۵۰۰ ق۔م تک پھیلا ہوا ہے۔ تیسرا دور عکادی (سارگون[2] اول عکادی) ہے جو ۲۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۲۴۰۰ قبل مسیح تک رہا۔ چوتھا دور گوتیم (GUTAIM) خاندان اور ار (UR) کے تیسرے خاندانِ سلاطین کا ہے جو قریباً ۲۵۰۰ ق۔م تا ۲۴۰۰ ق۔م قائم رہا۔ پانچواں دور، ایسین[3] (ISSIN) اور لارسا (LARSA[4]) کے خانوادہائے سلاطین سے لے کر بابل کے اولین خاندانِ سلاطین (کلدانی سلسلۂ شاہی) کے زوال تک تقریباً

۱۔ سومیری ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ ان کی سلطنت میں عظیم الشان شہر تھے۔ اور ان کی ایک باقاعدہ منظم شہری ریاستی حکومت تھی۔ اس دور میں دھات کا استعمال عام تھا۔ انہوں نے فن تحریر کا ایک نظام "خط میخی" رائج کیا۔ علم ریاضیات کو انہوں نے نمایاں ترقی دی۔ خاص طور پر قدیم زمانے میں مشہور مکعبی مساوات کی اختراع ان کے کارہائے نمایاں میں سے ہے۔ مزید براں انہوں نے فن حرب میں جدت پیدا کی اور نت نئی جنگی چالوں اور نئے نئے طریقوں کی تخلیق کی۔ اِس ضمن میں ان کو مکمل طور پر ہتھیار بند پیادہ فوجوں کی مربع شکل میں صف بندی کر کے باہم مربوط و ہم آہنگ کر کے لڑانے کی حربی حکمتِ عملی میں کافی مہارت حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلدانی، سومیری تمدن سے بہت متاثر تھے۔ کیونکہ قدیم بلوچی شاعری میں لفظ "سومیری" کافی استعمال ہوا ہے جو شان و شوکت اور فرحت و امارت کے معنوں میں مستعمل ہوتا رہا ہے۔

۲۔ آج تک بلوچوں میں ایک مضبوط قبیلہ "سرگانی" کے نام سے موجود ہے۔ جس کے معنی سرگان کی اولاد کے ہیں۔

۳۔ موجودہ سیقر۔ مترجم۔ ۴۔ موجودہ البحریات۔ مترجم

۲۱۵۰ ق.م تا ۱۷۴۰ ق.م کا ہے۔ رالینسن (RAWLINSON) کے نسبتاً زیادہ صحیح اسُور
کے کلیسائی اصولوں کے مطابق، از ۲۲۵۰ ق.م تا ۱۹۷۶ ق.م)۔ چھٹا دور کوشی خاندان
کے سلاطین کا ہے جو تقریباً ۱۷۴۰ ق.م تا ۱۱۵۰ ق.م تک رہا۔ ساتواں دور اسوریوں
کے تسلط اور بابل (کلدانی) کی آخری سلطنت کا ہے جو آخری کلدانی خاندان
سلاطین کے ۵۳۸ ق.م میں سائرس[۱] کے ہاتھوں مکمل خاتمہ تک محیط ہے۔ آٹھواں دور
ہخامنشیوں کے عہد کا ہے جو سکندرِ اعظم کے ہاتھوں درویش کی شکست تک ہے۔ اور
نواں دور سلوکی خاندان کے عہدِ حکومت پر محیط ہے۔

اب ہم عظیم دورِ حکومت کی مختصر داستان بیان کریں گے جو ایک المناک انجام
کو آ پہنچا۔ یہ حکمرانوں کی ایک ایسی نسل تھی جو تقدیر کے پنجۂ استبداد کا ناگہانی شکار بن گئی۔
ایک ایسی نسل ۔ جو دنیا کی اولین پُرعظمت تہذیب و تمدن کی خالق تھی، اس طرح گوشۂ
گمنامی میں چلی گئی کہ عبرت ہوتی ہے۔ ازمنۂ قدما کی تاریخ کے ان کلدانیوں کو، شورش
اور افراتفری کا شکار ہونے کے بعد، زمانۂ مابعد، اس نام سے سنا تک نہیں جاتا بلکہ
تاریخ کے وسطی ادوار میں ان لوگوں کو دیارِ غیر میں غیروں کی حکومت میں بلوص یا بلوچ[۲] کے
نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اس نام سے اپنے محبوب مہا دیوتا، مخصوص مذہب بیلوص
دیوتا اور بلوص مندر کی نسبت کی بنا پر مشہور و معروف ہوئے۔ بابل کی تہذیب و
تمدن سے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ دونوں نے فیض اٹھا کر اپنے حروفِ تہجی خانقاہوں
کی طرزِ تعمیر اور عظیم ادب اخذ کئے۔ اس کے زوال کے بعد ثقافت و تہذیب اور تخلیق کا

---

۱. کورش اعظم۔ ایران کا مدبر اور عظیم الشان شہنشاہ جنہوں نے ایرانیوں کی پہلی عالمی سلطنت کی بنیاد رکھی اور ۵۲۹ ق.م میں میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ مترجم

۲. بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ از سردار خان ص۱۶

مرکز مشرق وسطیٰ سے بحیرۂ روم کے علاقے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بابل کے بجائے بحیرۂ روم کے دو خطے، روم اور یونان تخلیق و تہذیب کے آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ مگر اب سیاسی اساطیر داستانوں کی تاریکی سے تحریری و تحقیق شدہ تاریخ کی روشنی کی جانب ہمارا سفر شروع ہوتا ہے۔ ہنما منشیوں کا ایک نیا خاندان ایک ایسی سلطنت کی حصول میں ہمیں طالع آزمائی کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے جہاں وہ نسلہا نسل تک "ہلال زرخیز" پر واحد خود مختار آقا کی حیثیت سے حکمرانی کر سکیں۔

نبوکد نضر کی وفات کے چھ سال بعد نبونیدس (NABONIDOS) (۵۵۳ ق م) سریر آرائے تخت ہوا جس کی تقدیر ایک مضبوط تر حکمران کے ہاتھوں جلا وطن ہو جانا تھی۔ وہ اپنے خاندان میں بدترین حکمران تھا۔ لہو و لعب کا دلدادہ تھا۔ غرور و تکبر اس کی گھٹی میں تھے۔ شہزادوں کے دل خوش آمد پر عموماً مچل جاتے ہیں۔ مگر وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے رہنما ہی ہمیشہ خوش آمدی اور چاپلوس لوگ ہوتے تھے۔ اس نے رذیل اور کمینہ افراد کو اپنے بیش بہا تحائف سے اشراف کا رتبہ دیا تھا اور امراء کو اپنے مال و متاع سے محروم ہو جانے کا ہمیشہ خدشہ ہوتا تھا۔ جب کہ بدمعاش اور بدکیش لوگ اس کی حماقتوں اور بخششوں سے نوازے جانے کے زعم میں ہمیشہ فرحان و خندان اور رقصان ہوتے تھے۔ اس نے زمانۂ امن میں اتنا کچھ خرچ کر ڈالا جتنا اس کے لائق و فائق پیشرو حالتِ جنگ میں بھی صرف نہیں کر پائے تھے۔ اس نے پوری سلطنت کو محصولات سے گران بار کر دیا تھا اور رعایا جہالت کی دم گھٹنے والی زندگی گذار رہے تھے۔ مایوسی و حزن و ملال اس پر سایہ فگن تھے۔ تشکیک و بے اعتباری اور زوال پذیری کی لٹکتی تلوار اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ سب کہہ و مہ بے اطمینانی کا شکار ہو کر چہ میگوئیوں پر اتر آئے تھے۔ اس کے دور میں بیکار امراء عیش و عشرت کے گرویدہ ہو گئے تھے اور اس کی شہنشاہیت میں زیادہ تر وقت، بیکار مشاغل میں

صرف ہوتا تھا. بابل کے تمام شہر سماجی و معاشی لحاظ سے زوال پذیر ہوئے. حکمران طبقہ مظالم اور بدکاری کا پیکر تھا. رعایا کی اجیرن اور ویران اور مظالم اور بدکاری کے پیکر حکمرانوں کی زندگیاں، عیش و عشرت اور سازش و برائیوں کا بدرنگ امتزاج ہو کر عدم توازن کا شکار ہو گئیں. شان و شوکت اور لہو لعب کی دلدادگی و شیفتگی سے دانش، فن اور حسنِ انتظام کا مرقع، تہذیب و تمدن اور مرجھا گئی. حاکم و محکوم دونوں طبقے اپنے روزمرہ معمولات، اعمال و افعال میں ہر حد کو پھلانگ کر آگے نکل گئے. ان کے ہر قول و فعل سے زوال پذیری کی قوتیں سر اٹھانے لگیں. اس سے حکومت کی بھاگ ڈور اپنے کھلنڈرے سے شہزادہ بلشظار (BELSHAZZAR) کے حوالے کر دی تھی. نبونیدوس کے کارناموں کے بارے میں اس کے کتبہ کے ساتھ آویزاں ایک سلسلہ وار فہرست کے مطالعہ سے اس امر پر بخوبی روشنی پڑ سکتی ہے کہ سائرس (کوروش اعظم) نے بابل کو کس طرح فتح کر لیا. نبونیدوس (۵۴۷ ق.م) کی تخت نشینی کا چھٹا سال تھا کہ ایلام میں "نشان کے بادشاہ" سائرس نے اپنے حاکم اعلیٰ استیاجی (ASTAGES) کے خلاف جو سیتھیوں[1] یا "مندا" کا بادشاہ تھا. اکبتانہ (ECBATANA) کے مقام پر بغاوت کر دی. سائرس کو فتح نصیب ہوئی اور اس نے اکبتانہ کو اپنا مرکز بنا لیا. اور اس طرح سیتھی (تورانی) سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوا. سائیتھیوں نے اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا. سائرس ایک قابل اور دیو پیکر سپہ سالار تھا. اس نے ۵۴۶ ق.م میں لیڈیا کے بادشاہ کروئیسس (CROESUS) کو شکست فاش دی. اس واقعہ کے دو سال بعد ہم اسے پورے فارس کے شہنشاہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس نے اپنی سرحدات کو ہندوستان کی سرحد تک پہنچایا تھا. اس کی دوسری

---

۱. ان کو "تورانی" بھی کہا جاتا ہے. مترجم

منزل بابل تھی۔ ۵۳۸ ق م فارس کے اس ناقابلِ شکست فاتح نے بابل پر ہلہ بول دیا۔ اس دوران نبونیدوس اپنے ملک کی شمالی سرحد پر واقع ایک قصبہ سپارہ میں تھا۔ اس کا بیٹا بلشضار، کلدانیوں کی کمزور، غیر مسلح اور کم تنخواہ حاصل کرنے والی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس کی زیرِ کمان، جون کے مہینہ میں میدان کارزار گرم ہوا۔ کلدانیوں کو شکست ہوئی۔ نبونیدوس اپنے پایۂ تخت کابل چلا گیا۔ چند روز بعد سپارہ کو حملہ آوروں نے فتح کر لیا۔ تموز[1] کی سولہویں تاریخ کو سپارہ پر قبضہ کرنے کے دو روز بعد سائرس (کورش) کی فاتح فوجیں کسی مقابلے کے بغیر بابل میں داخل ہو گئیں۔ اس کو فتح حاصل ہوئی کیونکہ اس کے لشکری اس کے انتہائی وفادار تھے۔ جبکہ نبونیدوس کے سپاہی کسی کے وفادار نہ تھے۔ نبونیدوس کو اس کی پناہ گاہ سے گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا گیا۔ اور کردوں پر مشتمل محافظ شاہی محل اور بلوص کے عظیم معابد کے دروازوں پر تعینات کئے گئے۔ تمام کلدانی سلطنت اس ناقابلِ شکست فاتح کے قدموں تلے پڑی ہوئی تھی۔ مارہشوان (اکتوبر) کی تین تاریخ کو سائرس خود بہ نفسِ نفیس وہاں پہنچا۔ گیریاث (GOBRYAS) کو بابل کا

---

(۱) تموز یہودی کلنڈر کا دسواں مہینہ ہے جو جون جولائی کے مہینوں میں پڑتا ہے۔ یہ بابلی کلنڈر سے اخذ کیا گیا ہے جو مصری کلنڈر کے قمری تھا۔ حموری سے پہلے شہری ریاستوں میں مہینوں کے نام جدا جدا تھے۔ مگر انہوں نے اپنی سلطنت میں یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر ہر جگہ مہینوں کے ایک ہی نام مقرر کر دیئے۔ یہودیوں نے یہی نام بابل سے لئے اور ابھی تک ان میں مروج ہیں۔ اس کیلنڈر میں مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں

۱۔ تشری ۲۔ مارہشوان ۳۔ کسلو ۴۔ تبت ۵۔ تبات ۶۔ ادار
۷۔ نسان ۸۔ ایار ۹۔ سوان ۱۰۔ تموز ۱۱۔ آب ۱۲۔ ایلولی

(مترجم)

والی مقرر کیا۔ اس طرح نبونیدوس کو ایسی شکست نصیب ہوئی کہ وہ کبھی سر نہ اٹھا سکا اِس بدقسمت خطّے میں اس کے بادشاہ کو بھی آرام کے لئے جگہ میسّر نہ آسکی۔ اور اس کو اپنے اہلِ وعیال کے ساتھ کرمان منتقل کر کے پسِ دیوارِ زندان دھکیلا گیا۔ جہاں ایک اذیتناک نادیدہ و ناشنیدہ اور وحشیانہ سلوک سے اس کی پذیرائی کی گئی۔ اور اسے ایسی افسوسناک بے بسی و بیکسی کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا گیا جو دوسروں کے لئے عبرتناک ہو۔ بابل اس وقت تک فارسی تسلّط کے طوقِ غلامی میں رہا۔ جب تک سکندرِ اعظم نے دارا سوئم کو ۳۳۱ ق م میں شکستِ فاش دی۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ علاقہ عنبر ماری (دریا کے پار) نامی والی کے زیرِ انتظام رہ کر اسی کے رحم و کرم پر رہا۔ سائرس (کوروش اعظم) کے بیٹے اور جانشین کیمبیس کی وفات پر دوسرے ہمسایہ صوبوں کی طرح اہلِ بابل نے بھی فارسیوں (ایرانیوں) کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تا آنکہ دردیش کو دوبارہ اسے فتح کرنا پڑا۔ بعد ازاں اس صوبہ کے حالات عموماً ناگفتہ بہ حد تک مخدوش

۱۔ کوروش کے بابل کے محاصرے اور فتح کے واقعہ نے تقریباً اساطیری و افسوی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور بہت سی دلچسپ کہانیاں اس سے منسوب ہیں (ملاحظہ ہو۔ دانیال کی کتاب اور اکسی نوفون کی سائرو پیڈیاز (Cyropedia of Xenophon)

مزید تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ Zeitschrift for Assyriologie ii, 2, 3 (1887)

از H. WINCKLER

۲۔ Records of the past, new series i. P. 22-31 (1888)

۳۔ The Higher Criticism P. 497-537 (1893)

از A. H. SAYCE

ہی رہے جہاں ہنگامہ خیزی، شورش پسندی اور افراتفری عروج پر تھی، بادشاہوں کی آمرانہ اور من مانی حکومت کے علاوہ مذہبی پیشوا بھی جابرانہ سیادت و قوت کے حامل ہو گئے۔ پورا خطۂ فارس کی سیادت کی فضا جبر و تشدد سے آلودہ ہو گئی۔ ہمارے باور کرنے کے لئے کافی آثار و شواہد اس امر کے غماز ہیں کہ درویشس اول کے دور سے ہی فارس حکومت ملک میں غیر ہر دلعزیز تھی، بلکہ درویشیس سوئم کے دور میں کلدانی سرزمین کو شدید مذہبی مظالم و شدائد کی آماجگاہ بنایا گیا حتیٰ کہ کئی کلدانی اور بابلی قبائل ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن میں اپنے خویش و اقارب کو الوداع کہہ کر ملکِ شام میں حلب[1] اور شمالی فارس کے علاقوں یعنی ایلان، گیلان اور ارمینیا کی جانب ہجرت کی۔ اس واقعہ سے طویل عرصہ قبل تقریباً ۱۶۰۰ ق م میں، بابل سے بجانب مغرب، شام اور شمال مغرب کی جانب ارامی مہاجرین کے قافلے کے قافلے ہیں ہجرت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشوری بادشاہوں کی سخت اور ٹھوس سلطنت، جو وحشیانہ عسکری طاقت کے بل بوتے پر قائم تھی نسبتاً غیر فعال و کم متحرک سامی قبائل کی آزادی کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ ہمسایہ بادشاہوں کی تقدیر ہی یہی تھی کہ وہ یا تو فوراً بہ رضا و رغبت سرِ تسلیم خم پر آمادہ ہوں، یا عزمِ صمیم کے ساتھ مجنونانہ رزم آرائی پر کمربستہ ہوں۔ شلمانیسر (SHALMANESER) اوّل اپنے والد اشور نذیر پال (ASHUR NAZIR PAL) سوئم ۸۵۸ ق م کے بعد اشوریہ کے بادشاہ بنے۔ اس نے بابل، مسوپوٹیمیا اور شام کی اقوام سلیشیا (CILITIA) اور ارارات کی سب ہمسایوں قوموں کے خلاف متواتر کئی تباہ کن معرکے سر کئے۔ اپنے مقابل آنے والی ہر شے اور قوت کو شکست دیتے ہوئے اس نے دمشق کے علاقے کا محاصرہ

۱۔ بلوچوں کی عام روایات میں حلب، بلوچ نسل کے اصل وطن کے طور پر مشہور و معروف ہے۔

کر لیا۔ اُس ترقی یافتہ اور کثیر آبادی کے حامل شہر کو تہہ و بالا کر دیا۔ اس کی ذی شان عمارات کو نذرِ آتش کر دیا۔ کوئی گھر بھی حملہ آوروں کی لوٹ مار سے باقی نہ بچا۔ اور آنکھوں کو لبھانے والی تہذیب و عظمت کی غماز ہر شے کو مسخرانہ انداز میں مسمار کر ڈالا گیا۔ سمیریہ کے جیحوا (JEHU) نے اسے نذرانۂ عقیدت پیش کر کے اپنی مملکت بچالی۔ بعد ازاں اس نے بابل پر لشکر کشی کر کے آگ اور خون کی ہولی کھیل کر شہر کو جہنم زار بنا ڈالا۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اپنی فتوحات کو دُور دُور تک جنوب کی جانب کلدانی ساحلی علاقے تک پھیلا کر، بابل کے بادشاہ کو تہہ تیغ کر دیا۔ بابل کا ممتازِ جہاں و مفتخر و نازاں شہر، ترقی کے اوجِ کمال سے، تباہی و بربادی کے آگ اور طوفان میں گر کر اس طرح تہس نہس اور ویران ہو گیا، گویا کہ اسے ماتمی لباس پہنا کر زبان حال میں اپنے ناقابلِ تلافی نقصان اور عظمت رفتہ کے لئے ماتم و نوحہ کناں ہونے کے لئے چھوڑا گیا۔ ۸۳۶ ق۔م میں طباری (طبل) کپادیشیا (CAPPA DACIA) اور سلشیا کا بھی یہی حشر ہوا۔ جب علاقے اشوری وحشت و بربریت کے شکار ہوئے تو اس دھات کے دور میں میسوپوٹیمیا کے کئی قبائل نے بکثرت اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اس نسل پرست اور ظالم حکمران کے، جس نے اپنی نسل میں خونریزی اور حیوانیت کی صفات کی بناء پر سب پر فوقیت حاصل کی تھی، دائرۂ اثر سے بہت دور واقع علاقوں کا رخ کیا۔ وہ صحیح معنوں میں یکتا و مثالی جابر مطلق العنان سلطان تھا۔ اس نے اپنی ہوسِ ملک گیری میں تہذیب، شرافت، شائستگی، مروّت اور تدبّر کے تمام مسلّمہ اصولوں کو پامال کر دیا تھا، اس نے اپنے تخت و تاج کی بنیادوں کی آبیاری

RECORDS OF THE PAST NEWSERIES، IV، 39-79

از: V. SCHEIL

معصوم اور معزز و نجیب سامیوں کے خون سے کی تھی اس وحشتناکی اور قہر و غضب سے ارض و سما بھی پناہ مانگتے تھے۔ وہ فطرتاً دوزخی شیطان کا پیکرِ قبیح تھا —— لوحِ تقدیر میں دائمی عذاب ہی اس کا مقدر ہے !۔ اس کے سر پر ہمیشہ قتل و غارت اور خون خرابہ کا بھوت سوار رہتا تھا جو ہزاروں بے گناہوں کے نظارۂ خون سے فرحت و انبساط حاصل کرتا تھا۔ ان کلدانیوں نے جنہوں نے ارمینیا کو ہجرت کی، وہاں ایک سلطنت کی داغ بیل ڈال دی۔ اور اس سرزمین کو اُرارتو (URARTU) کا نام دیا۔ اُرارتو (ارمینیا) میں مینوآس (MENUAS) ابنِ اسپوی نیس (ISPUINIS) اپنے خاندان میں سب سے زیادہ طاقتور حکمران تھا۔ اسپوی نیس، آشوریہ کے عدد نیراری (ADADNIRARI) چہارم ابن شلمانیسر سوئم کا ہمعصر تھا جو ۲۵ رتبت ۸۲۷ ق م تخت نشین ہو کر ۱۲ ابتت ۷۲۳ ق م تک صریر آرائے سلطنت رہا۔

بلوچ فارس میں :

ہمارے مشاہدے میں آیا کہ داخلی افراتفری و طوائف الملوکی اور بیرونی حملوں کے مختلف ادوار میں، بابلی قبائل نے کس طرح اپنے اصلی مادرِ وطن کو خیرباد کہا اور شام اور شمالی فارس کے بالائی علاقوں کی جانب کا رُخ کیا۔ قابلِ تعظیم اور معزز کلدانیوں نے شمالی فارس میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ایک نئے دور میں داخل ہو کر اختلاط کے عمل کا آغاز کیا۔ چند صدیوں کے اندر اندر، پوری نسل نے بابل کے سامیوں کے ساتھ اپنا نسبی اور لسانی رشتہ فراموش کر دیا۔ اپنے تاریخی مادرِ وطن بابل کو بھلا دیا۔ اپنی زبان بھول گئے۔ اپنے نسلی شہرہ اور عظیم تابناک تاریخ کی یادوں کو محو کر دیا۔ وہ رفتہ رفتہ دُنیا کی آئندہ تواریخ میں بلوچ مشہور ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نسل اور خون کے فطری افتخار، نسلی روایات و رواجوں کے علاوہ، اپنی ہر متاعِ عزیز گنوا دی۔ تاریخ کی تمام ناانصافیوں کے باوجود وہ منتشر حالت میں بھی ایک ایسی

نسل رہے جو تفخر و افتخار سے سرشار رہی۔ گو کہ اس کی نہ تو کوئی منزل تھی نہ تو اس کا کوئی مستقبل تھا۔ نہ وہ کسی مال و متاع کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے نسلی و خونی افتخار سے سرمست و مدہوش تھے جو محتاجِ مال و متاع نہ تھا، وہ ایک ایسی بہادر نسل کے فرزند تھے جس کا کوئی رہنما نہ تھا اور جس کی کوئی ریاست نہ تھی، وہ پہاڑوں سے اُترے ہوئے سیلِ رواں کی مانند خانہ بدوشوں کے جمِ غفیر سے تعلق رکھتے تھے جس کی کوئی متعینہ حدود و سرحدات نہ تھیں۔

۵۰۰ ق م سے لیکر پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام تک فارسی (ایرانی) بادشاہوں کے زیرِ نگین رہتے ہوئے وہ تمام عرصہ ایک حرکت پذیر آبادی کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ دور اُفتادہ علاقوں میں تحفظ اور معاش کی تلاش میں ہجرت و مسافرت کرتے رہے۔ گذشتہ بیس صدیوں کی تاریخ بلوچ قوم کے لئے حزن و ملال، مایوسی، بدبختی اور آفتوں کا مرقع و مجموعہ ہے۔ یہ نسل صدیوں تک کردستان، گیلان ایلان اور ارمینیا کے کہستانی علاقوں میں مقیم رہی۔ کچھ عرصہ قبل تک وہ فارس کے وسطی علاقوں میں منتشر پڑے تھے۔ شمالی صوبوں سے ان کی ہجرت سے لے کر صوبۂ کرمان میں مستقل سکونت اختیار کرنے تک کی مدت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شاید ان کی ہجرت کا باعث، بدنام و رسوائے زمانہ، سفاک، وحشی اور بربریت کے غماز ہنؔ[1] لوگوں کا حملہ تھا۔ انہوں نے مشرقی یورپ اور ایشیا کے کچھ حصوں کو، جو

۱۔ ان کو شاہنامۂ فردوسی میں ہیتال کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ہُن غالباً منگول یا تاتاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے جسم بھاری اور گھمبیر ہوتے تھے۔ ان کے پیر زین پر مسلسل سواری کی وجہ سے مڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ناکیں چپٹی تھیں اور آنکھیں سوروں کی مانند تیز اور چمکتی ہوئی ہوتی تھیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

خوشحال تھے اور جہاں دولت فراوان و وافر تھی، اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ انہوں نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے مراکز اس طرح مکمل طور پر نذرِ آتش کر دیئے کہ انکے نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

فردوسی اپنے طویل رزمیہ شاہکار میں نوشیروان کے کارناموں کو ممکن حد تک وثوق و تیقن کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہ شہنشاہ ایک افسونی شخصیت نہ تھی بلکہ کلاسیکی مورخین و ادباء کا موسومہ معروف خسرو تھا جنہوں نے نامور و مشہور شہنشاہ جستینیاں (JUSTINIAN) (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء عیسوی) کی عسکری قوت کو للکارا۔ اس طرح اس کے تمام سوانح حیات تاریخ کے احاطۂ تحریر میں آتے ہیں۔ نوشیروان نے گیلان اور ایلان کے لوگوں کے خلاف پیش قدمی کی۔ اور فردوسی نے اس فہرست میں بلوچوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو بقولِ اس کے نہایت شورش پسند تھے اور حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اردشیر کے شہرۂ آفاق لشکر کو بھی شکستِ فاش دی۔ شہنشاہ نے بلوچوں کے خلاف بہ نفسِ نفیس ایک مہم کی سرکردگی کی اور ان کو بڑے پیمانے پر تہہ تیغ کر دیا۔ فردوسی کے مطابق کوئی بھی بلوچ زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ خواتین، بچے اور لڑنے کے قابل سب لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور کوئی شخص عیان و نہان باقی نہیں رہا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ بعد ازاں نوشیروان نے اپنی افواج میں بلوچوں کو بھرتی کیا جو نڈر اور جری تھے۔ ایک اور موقع پر شہنشاہ نے گیلان، دیلمان، کہستانہائے بلوچ دہشت بامے سروچ اور تلوار کے دہنی کوچوں سے لشکر جمع کر کے آذربائیجان میں محاذ آرائی کی۔ نوشیروان

(بقیہ گزشتہ صفحہ)

قارئین تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کریں:۔

1. Medieval Europy by

Brown, Haroourt, Brace and Company, 1932, P. 29.

انصاف کے اُصول کے برعکس انصاف کرنے کے لئے مشہور نہ تھا بلکہ وہ دراصل وحشت، بربریت اور سفاکیت کا ایسا عفریت تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس نے ان خطوں کے قبائل پہ کئی مرتبہ ہلاکت خیز لشکر کشیاں کیں۔ اور غالباً بلوچوں نے شہنشاہ کی خوف یا خوشنودی کی خاطر ان کہستانی خطوں کو خیرباد کہنا پسند کیا اور فارس کے وسطی حصوں کی جانب کوچ کیا۔ شہنشاہ کی جابرانہ اور سخت گیر پالیسیوں کے باوجود بلوچوں نے کبھی عجمی (ایرانی) سیادت وحاکمیت اور نسل کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور نہ ہی اسے دل وجان سے پسند کیا۔ فارس میں اپنے پورے قیام کے دوران بلوچوں کو تفخر و افتخار اور ان کی ہمت وقوت ہمیشہ ہمیشہ امتحان وآزمائش کے مرحلوں سے گزری۔ اہلِ فارس، ارباب اقتدار واختیار کی پرستش و پوجا کرتے تھے۔ مگر بلوچ عزت و وقار اور نسل وخون کے افتخار کے شیدائی تھے۔ گذشتہ چودہ صدیوں میں سرزمینِ فارس مختلف نسلوں کے عروج وزوال اور ان کی گوناگوں خصائص وخصلتوں کا مرکز رہی ہے۔ زمانے نے مختلف تہذیبوں اور سلطنتوں کے ارتقاء و ترقی اور زوال کو دیکھا ہے۔ تاریخ نے مختلف خاندانوں کے بوقلموں حکومتوں، مختلف قسم کی سماجی واقتصادی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور کئی ابھرتی چلی گئیں اور فنا ہوتی رہیں۔ لیکن دو بڑی نسلوں فارسیوں (ایرانیوں) اور بلوچوں کے درمیان نسلی امتیاز، نفرت اور بعد کا آج بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ بلوچ فارسیوں سے صمیم قلب کے ساتھ اتنی ہی نفرت کرتے ہیں اور کدورت رکھتے ہیں جتنی کہ اہل فارس بلوچوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اہل فارس، بلوچوں کو احمق اور گنوار تصور کرتے ہیں جبکہ بلوچ ان کو سازشی اور فریب کار سمجھتے ہیں۔

عرب کا ایرانی نژاد مورخ احمد بن یحییٰ البلاذری خلیفہ عمر فاروق اعظم کے زمانے میں بلوچ زعماء میں سے کسی ایک کے بارے میں ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں[1] اور لکھتے

۱۔ فتوح البلدان ص ۳۴۳

ہیں۔ کہ سیاہ السّواد کو جو یزدجرد کے معزز شرفا میں سے تھا۔ مؤخر الذکر نے چند سو سپاہیوں کے ساتھ الاحواز کی جانب روانہ کیا۔ وہ القلبانیہ کے قریب قلعہ بند ہو گیا جس کے نواح میں ابو موسیٰ العشری نے الشوش کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور اُس ایرانی لشکر کے ہر فرد کو تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔ فاتح مسلمان فوجوں کی شان و شوکت اور قوت و سطوت نے سیاہ السّواد کو متاثر کیا اور اس نے ہمت ہار کر مندرجہ ذیل خفیہ پیغام ابو موسیٰ اشعری کے نام ارسال کیا:۔

"ہم تمہارے بدترین دشمنوں کے خلاف لڑنے کو تیار ہیں۔
اگر آپ کے لوگوں کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہوا تو ہم غیر جانبدار رہیں گے
اگر وہ ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائیں گے تو آپ ہمارا ساتھ دینگے اور
ہمیں عربستان کے کسی بھی خطے میں اپنی پسند کی جگہ پر رہنے کا اختیار
ہوگا۔ مزید برآں ہمیں خاص مراعات اور بخششیں عنایت کی جائیں۔
ہماری خواہش ہے کہ مذکورہ شرائط پر آپ کا بالائی حاکم مجاز، جس نے آپکو
یہاں بھیجا ہے، مہر تصدیق ثبت کرے۔"

اس طرح ابو موسیٰ نے امیر المؤمنین کو سیاہ کی خواہشات اور اس کے مطالبات سے آگاہ کر دیا۔ ابو موسیٰ کے نام خلیفہ نے جواب میں حکم صادر کیا کہ "انکے تمام مطالبات تسلیم کئے جائیں"۔ سیاہ قلعہ کو چھوڑ کر مسلمان لشکر میں شامل ہو گیا اور شوستہ اور قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب عربوں نے فارس پر چڑھائی کر دی تو شوستہ ان کی بُت شکن غیظ و غضب کا نشانہ بننے والے اولین شہروں میں سے ایک تھا۔ بعد ازاں سیاہ بصرہ چلا گیا اور بنی تمیم قبیلہ کا حلیف بن گیا۔ البلاذری کی روایت کے مطابق کچھ عرصہ بعد سیاہ بجہ اور زت (جت) قبائل بصرہ ہی میں سیاہ السّواد سے مل گئے

سیاہ بجہ[1] کے معنی پائے سیاہ کے ہیں۔ اور سیاہ پاد (کالے پیر) کے نام سے ایک بلوچ قبیلہ، خاران، سبی اور سندھ میں آباد ہے۔

سیاہ سواد کا ذکر رضا شاہ پہلوی کے ملک الشعرئ ملک بہار مرحوم نے اپنی ضخیم کتاب شاہنامہ میں سیاہ بلوچ[2] کے نام سے کیا ہے۔ اس محبِ وطن فارسی شاعر نے شوستہ اور اس کے نواحی قلعوں کے سقوط کا ذمہ دار سیاہ بلوچ کے غدارانہ سازشوں کو قرار دیا ہے۔ اس نے اس عظیم بلوچ رہنما اور بطلِ جلیل کے کارنامے کی شدید مذمت کی ہے۔ اور اظہار کیا ہے کہ عرب سپہ سالار نعمان بن مقران نے اپنی مہم کی ناکامی کے بعد سیاہ بلوچ (سیاہ السّواد) سے مدد طلب کی جس کی غداری اور فریب کاری کے نتیجے میں ایرانیوں کو شکست اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شاعر نے جوشِ جنون اور جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی رزمیہ نظم میں سیاہ بلوچ کو بدمعاش، فریبی اور موقع پرست شخص قرار دیا ہے۔ خاندانِ امیہ کے دورِ ملوکیت میں سیاہ السّواد کے خاندان نے ایک تاریخی کردار ادا کیا تھا۔ مروان اول (۶۸۳-۸۵ء) نے جو اموی خاندان میں مروانی شاخ کا بانی تھا۔ اپنی وفات سے کچھ پہلے جیشی بن دلجہ کی سرکردگی میں ایک شامی فوج کو مدینۃ المکرم کے لوگوں سے بیعت لینے کی خاطر مدینہ روانہ کیا تھا۔ الحجاز کے لوگ عقیدہ اور مسلک کی وجہ سے عبداللہ ابنِ زبیر کے پیروکار تھے۔ اور اس کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے معظم و معزز خاندان کے بعد خلافت کے واحد دعویٰ دار تھے۔ ابنِ زبیر نے عباس بن سہل کی نگرانی میں ایک لشکر شامیوں کی

۱۔ طبری نے عسایاجہ۔ افغانی نے استاباجہ اور ابن اثیر نے عشاباجہ کے مختلف ناموں سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ ملاحظہ ہو۔ شاہنامۂ نوبخت۔

پیش قدمی روکنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ربضہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا اور شامی سالار جیش، زید بن سیاہ السوار (سیاہ بلوچ) کے تیر کا نشانہ بن کر موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ شامی فوج سراسیمگی کی حالت میں رسوائی و ذلت کے ساتھ پسپا ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ زید بن سیاہ السوار سفید عبا زیب تن کئے، اپنے سفید خراسانی توسن رہوار پر سوار ہو کر المدینہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوا اور مدینہ کے شہریوں نے داد و تحسین کے غلغلوں کے ساتھ والہانہ انداز میں اس کا بے نظیر استقبال کیا۔ اور اس پر عطر و خوشبوؤں کی اس قدر بارش کی مانند چھڑکاؤ کی کہ اس کی سفید عبا کی رنگت سیاہ ہو گئی[1]۔

بلوچ کرمان میں :-

خلفائے راشدین کے زمانہ میں ہم صوبۂ کرمان کو بلوچوں کی آماجگاہ پاتے ہیں کرمان میں ان کی سکونت پذیری کے پس منظر میں اس نسل اور اس صوبہ کے غم و اندوہ کی ایک طویل داستان پوشیدہ ہے۔ جب عرب سپہ سالار عبداللہ ابن عبداللہ القصلی نے ۲۲ ہجری (۶۴۳-۶۴۲ء) میں کرمان کے صدر مقام کو فتح کیا تو کرمانیوں نے کوچ اور بلوچ (کوچ اور بلوچ) سے امداد طلب کر لی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا[2]۔ سعودی نے بلوچوں اور کوچوں کا ذکر کیا ہے جو اُس زمانے میں کرمان کے پہاڑوں میں آباد تھے۔ اصطخری نے اپنی شہرۂ آفاق تاریخ تقریباً ۳۴۰ ہجری بمطابق ۹۵۱ء میں مکمل کر دی تھی اس میں لکھا ہے کہ بلوچ قفص کے پہاڑوں میں رہتے ہیں جہاں کوئی بھی جھانکنے اور داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ مال مویشی پالتے ہیں اور خیموں میں رہتے ہیں۔

۱۔ طبری۔ جلد دوئم۔ باب دوئم۔

۲۔ تاریخ گزیدہ از حمید اللہ مستوفی (متوفی تقریباً ۱۳۴۰ عیسوی)

ان کے علاقے سے گزرنے والے راستے محفوظ نہیں ہیں۔ یاقوتی جس نے اپنا جغرافیہ ۶۱۵ ہجری میں مکمل کیا تھا، کرمان کے پہاڑوں کو کوچ و بلوچ اور قاآن کے کہستانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کوچ (قفص) لمبے قد کھاٹ کے تھے اور جابر و ظالم انسان تھے۔ ان کا گذر اوقات لوٹ مار پر تھا۔

پہلے بلوچ لوٹ مار میں حملہ آور قبائل میں سے سب سے زیادہ سفاک تھے مگر ان کو عبید الدولہ دیلمی نے تباہ و برباد کر دیا جس کا ناخوشگوار دورِ حکومت ۳۳۸ تا ۳۷۲ ہجری (بہ مطابق ۹۶۹ء تا ۹۸۳ عیسوی) پھیلا ہوا تھا۔

ابن حوقل اپنی ثقہ تاریخ میں صوبہ کرمان کی حدود کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "اس کے مشرق میں مکران کا علاقہ و ریگستان اور بلوچیوں کی سرحد پر واقع سمندر ہیں۔ اس کے مغرب میں فارس ہے۔ اس کے شمال میں خراسان اور بجستان کے ریگستان ہیں۔ اور اس کے جنوب میں فارس کا سمندر واقع ہے"[۲]۔

پانچ صدیوں سے زائد عرصے تک بلوچ صوبہ کرمان کے باشندے رہے اور پہاڑی علاقوں میں زندگی گزارتے رہے۔ ان کی خانہ بدوشانہ زندگی ان کی تمام ضروریات کے لئے موزوں و مناسب تھی۔ کوہستانی خطوں کی قوت افزا آب و ہوا میں پرورش پانے اور خوگرِ حرب و ضرب ہونے کی بناء پر وہ نڈر، جانباز اور سرفروش جنگجو ثابت ہوئے۔ اس وحشی اور جیالی مگر عجیب و غریب نسل سے تمام ہمسایہ لوگ مرعوب اور خوف زدہ رہتے تھے۔ ان کی خوئے بد کی خوگر تلوار ہر شخص کی گردن اڑانے پر تلی ہوئی تھی اور ہر شخص ان کے خلاف رزم آرائی کے لئے تیغ بدست کمربستہ تھا۔ کرمان پر

۱۔ تاریخ اصطخری مرتبہ از MORTLTMONN

۲۔ کتاب المسالک و ممالک مترجمہ سر ولیم اوسلے (SIR VILIAM OUSLAY

جس خاندان کی بھی حکمرانی رہی، وہ کسی حکمران کے اقتدار و اختیار کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور وہ تخت و تاج اور عوام دونوں کے لئے مستقل خطرہ کی علامت بنے ہوئے تھے۔ حملہ آور فوجیں ان کو ہمیشہ ناقابل تسخیر پاتی تھیں۔ کرمان، خراسان اور سیستان کے درمیان کاروانوں کے تمام راستے، سڑکیں اور علاقے غیر محفوظ تصور ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ زائرین کے کاروانوں پر ہاتھ ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے، کرمان میں اِس نسل کے قیام کی تاریخ، مستقبل تبدل و تغیرات کے وحشتناک واقعات سے بھرپور ہے۔ ان شیطانی پیکروں کی بربریت اور سفاکیت سے اصفہان اور غزنی کے شاہی دربار بھی کئی بار چوکنا ہو گئے تھے۔ مالِ غنیمت ان جنونی اور مصدقہ متلاشیوں کے باغیانہ سرکشیوں اور لوٹ مار کرنے کے رجحانات کی بنیادی وجہ غالباً یہ تھی کہ کرمان کے حکمرانوں کی خودکشی کی ترغیب دینے والی اور نسل کُشی کی پالیسیوں نے ان کو نیم قانون شکن اور نیم وحشیانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا، نہ کہ اس کی وجہ ناقابلِ اصلاح بدخوئی اور بدسرشتی تھی۔ المقدسی نے کرمان، صحرائے لوط اور مکران کی جانب سفر اختیار کیا تھا اور تقریباً ستر دنوں تک اس راستے میں سفر کرتا رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ پورے صحرا میں بلوص (بلوچ) قبائلیوں کے مصروفِ گشت جھتوں نے دہشت گردی پھیلا رکھی تھی اور کرمان کی سرحد قفص[1] کی پہاڑیوں میں ان کی قلعہ بندیاں تھیں۔ وہ بلوچوں کی تعریف یوں کرتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں جن کے چہرے وحشتناک ہیں۔ دلی بدخو ہیں اور نہ

۱۔ ایک مشہور و معروف عالم فرلانگ (FORLANG) کا کہنا ہے کہ کوش کے لڑکے (نمرود) کے آباواجداد کاصوص اور بلوص کے القاب سے شام اور فونیشیا آئے تھے اور وہاں انہوں نے کئی شہر بسائے۔ شاید انہی کاصوص اور بلوص کو دسویں صدی کے مورخین نے قفص و بلوص اور فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں ان کو کوچ و بلوچ کا نام دیا ہے۔

ان کا کوئی اخلاق ہے اور نہ طور طریقے اچھے ہیں۔ کوئی بھی شخص ان سے مل کر صحیح سلامت واپس بچ کر نہیں جا سکتا اور جب ایک دفعہ کوئی پکڑا جائے تو وہ اسے کسی سانپ کی طرح سنگسار کر کے ختم کر دیتے ہیں۔ کسی انسان سر کو وہ کسی بڑے گول پتھر کے ٹکڑے پر رکھ کر اس وقت تک اس کو اس کے ساتھ ٹھکرا کر مارتے رہتے تھے جب تک وہ پاش پاش نہ ہو جاتا۔" اور جب المقدسی نے اس غیر انسانی فعل کی وجہ دریافت کی تو اس کو جواب میں بتلایا گیا کہ وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں تاکہ بلا ضرورت ان کی تلواریں کند نہ ہو جائیں

صوبۂ کرمان بویہ خاندان کے تخت و تاج کے دعویداران کے درمیان مخاصمت وعناد کا باعث بنا ہوا تھا جو یہ سلطان جنہوں نے قفص اور بلوچوں سے متواتر امداد طلب کی تھی، اپنے ان غیر مطمئن اور دل آزار عزیزوں کے خلاف کافی عرصہ تک صف آرا رہا۔ تاہم یہ طوفان خیز تمہید ایک ناخوشگوار اعادہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی ۳۲۴ (بمطابق ۹۳۶ء عیسوی) میں جب علی بن بویہ اور اس کے بھائی حسن، فارس — اور اصفہان پر بالترتیب حکمران تھے۔ تو ان دونوں بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائی ابوالحسین کو کرمان بھیجنے پر اتفاق کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے پندرہ سو منتخب دیلمی اور پانچسو ترک شہسوار، دیگر افواج کے علاوہ دیئے۔ عبد الحسین احمد[1] بن محمد رازی جو "کوردبیہ" (اندھے کاتب) کے لقب سے مشہور تھا اور جو ابوالحسن احمد بن بویہ کا معتمد خاص تھا اپنے آقا کے ساتھ روانہ ہوا۔ ابراہیم بن سنجر دولتی جو والئ خراسان کا نمائندہ تھا، اس وقت محمد بن الیاس بن الیاسا سغدی کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ جب اس نے دیلمیوں کی فوج کشی اور یلغار کا حال سنا تو اس نے محاصرہ اٹھا لیا۔ محمد بن الیاس

۱۔ احمد کا والد بحر خزر کے جنوبی ساحل پر واقع کوہستانی خطے کے دیلمیوں کے ایک جنگجو پہاڑی گروہ کا سردار تھا۔

موقع کو غنیمت جان کر بم کے قلعے سے جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ابوالحسین نے اس کا تعاقب کیا مگر بے سود۔ تاہم وہ مداخلتِ بیجا کے مرتکب کو بیدخل کرنے میں کامیاب رہا۔ جس کا وقار اب سارے جہاں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گر رہا تھا۔ الیاس مقابلہ کرنے کی سکت نہ پاکر سیستان کو واپس ہوا اور کسی کا بال بیکا کئے بغیر غائب ہوگیا۔ ابوالحسین احمد نے بم کی نگرانی اپنے ایک ماتحت افسر کے سپرد کردی اور خود کرمان کے صدر مقام جیرفت کی جانب پیش قدمی کی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس سے بلوچوں اور قفسوں کے سردار علی بن زنجی[1] قاصد جو علی بن کلاّ دیہی کے نام سے زیادہ معروف تھا اور جس کے آباؤ اجداد اور بعد ازاں وہ خود ان علاقوں کے مالک بن گئے، ایک قاصد سے مُلاقات کی۔ وہ زبانی طور پر ہر سلطان کی بیعت کرتے تھے مگر کبھی بھی اس کے اطاعت گذار نہیں رہتے تھے۔ علی بن زنجی نے احمد بن بُوَیہ کو زر و مال کی پیشکش کی مگر اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اس کے بھائی کو ہے۔ اور وہ بہر صورت جیرفت میں داخل ہوجائیگا پھر وہ اس پیشکش کے بارے میں اپنے بھائی کو پیغام بھیج کر مطلع کرے گا۔ دریں اثنا اس نے ابن کلاّ دیہی کو جیرفت خالی کرنے کا حکم دیا۔ مؤخر الذکر راضی ہوگیا۔ اور قصبہ سے دس فرسنگ کے فاصلے پر واقع ایک مقام پر چلا گیا۔ کئی پیغامات کا تبادلہ ہوا اور آخر کار یہ قطعی فیصلہ ہوا کہ ابن کلاّ دیہی اپنا ایک یرغمال، احمد بن بُوَیہ کے پاس روانہ کردے اور وہ اس علاقے کو دس لاکھ درہم سالانہ کے ادائیگی کی شرط پر بطور جاگیر اس کو منتقل کردے گا۔ اس کو فوری طور پر ایک لاکھ درہم نذرانہ پیش کیا گیا جو کہ جاگیر کے مالیہ کا حصہ نہ تھا۔ ابن کلاّ دیہی نے احمد بن بُوَیہ کے نام کو خطبہ میں رائج کیا۔ اور مالیہ کی ایک قسط بھی پیشگی ادا کردی۔ شکست خوردہ

۱۔ اصل لفظ زنگی ہے جو بلوچوں میں اب بھی بطور نام مستعمل ہے۔ عربی رسم الخط میں گ کا حرف ج سے بدل گیا ہے ۔ مترجم۔

ذہنیت کے حامل رذیل، سیاہ شکل اور عجیب وغریب شیطان صورت کور دبیر نے اپنے آقا کی خوشنودی کی خاطر، اسے اپنے دامِ تزویر میں پھانس کر ایک قابلِ نفرین منصوبے کا مشورہ دیا. اس نے احمد بن بویہ کو تلقین کی کہ وہ ابنِ کلاویسی پر اچانک شبخون مارے جبکہ وہ اور اس کے ساتھی طے شدہ معاہدہ اور مخاصمتوں کے خاتمہ پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں. کور دبیر نے اپنے آقا اور حاکم کو یہ سبز باغ دکھایا کہ اس مہم کے سر کرنے پر وہ نہ صرف ابنِ کلاویسی کی بے پناہ مال و دولت اور خزائن کا مالک بن جائے گا اور اس علاقے کا مالک بن بیٹھے گا بلکہ یہ اس کے لئے ایسی شہرت اور نام ونمود کا دروازہ بھی کھول دے گا جس کے لئے کبھی نہ کسی نے جسارت کی ہے اور جو نہ کبھی کسی کو نصیب ہوا ہے. احمدؔ بن بویہ ایک طرف تو ایک کم ظرف ناتجربہ کار شہزادہ تھا اور پھر بوالہوسی کا شکار ہو کر اسے وفورِ جوش وجذبات میں اپنے معتمد کی ریاکارانہ اور مہربانہ تجویز کو شرفِ قبولیت بخش کر تحسین وپسندیدگی کا اظہار کیا. اس پر عمل کر کے اپنی افواج کو تیار اور کمربستہ کر دیا. اور شبخوں مارنے کے زعم میں جلد بازی میں ان کو روانہ کر دیا. لیکن اسے یہ قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ اس کا نتیجہ برعکس نکل کر اس کے لئے باعثِ رسوائی وبدنامی بھی ہو سکتا ہے. اور اس کی تمام دل خوش کن امیدوں پر پانی پھر جائیگا. وہ سورج طلوع ہونے تک فتح ونصرت کی خوشخبری سننے کا متمنی تھا. جھوٹے وقار اور چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کی تلعی جلد کھل جاتی ہے. اس کی طاقت کا نشہ جلد کافور ہو گیا کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت اور اصولِ فطرت ہے کہ چاہ کن را چاہ درپیش ہوتا ہے۔ اور

---

۱. مسکاویہ کی اصل کتاب "تجریب الامم" کا انگریزی ترجمہ
تجرباتِ اقوام (THE EXPERIENCES OF NATIONS) از ڈی. ایس. مارگولیوث
(D.S. MARGOLIOUTH) جلد اول. صفحہ ۳۹۸

تیزی سے بھاگنے والا جلد ہی تھک کر چور چور ہو جاتا ہے۔ ابن کلّاوبی ایک باہمت حوصلہ مند اور باحمیّت شخص تھا۔ وہ جفاکوشی اور دور اندیشی کے زیور سے مزیّن تھا۔ اس نے چشم زدن میں اپنے لوگوں کو جمع کیا۔ ان کو آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار و آمادہ کر کے کیل کانٹے سے لیس کر دیا۔ اور ان کو دونوں پہاڑوں کے درمیان واقع تنگ درّہ میں تعینات کر کے گھات میں بٹھا دیا جہاں سے حملہ آوروں کو گزرنا تھا۔ جب رات کی گہری تاریکی میں احمد بن بُویہ اپنی قابل نفرین افواج کے ساتھ رات کی خاموشی کو چیرتا ہوا درّہ کے عین وسطی حصّے کو عبور کر رہا تھا تو جیرفت کے جیالے لوگوں (بلوچوں اور قفضوں) نے اچانک بلہ بول کر ان کو گھیر لیا۔ جُرأت وجانبازی، اسلحہ اور تعداد کی بہ نسبت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ دیلمی افواج کو چٹانوں پر بھاگنا پڑی۔ تاریکی، بے حوصلگی اور بدنظمی کی حالت میں، باہمت دشمن نے ان کو چاروں جانب محصور کر کے اپنے نرغے میں لے لیا۔ اور ان پر چھا کر کاری ضرب لگادی۔ بلوچی لشکر جرّار کے مقابلے کی تاب نہ لاکر وہ سراسیمہ اور حواس باختہ ہو گئے۔ مکمل تباہی و بربادی ان کا مقدّر بن گئی۔ بلوچ شمشیر زنوں نے ایک سنہری کارنامہ سرانجام دیا۔ ان کے سنگین اور ہلاکت خیز ضربات نے برقِ تپاں بن کر دشمن کی صفوں میں تہلکہ برپا کر دیا۔ دشمن کے لشکر کی بڑی تعداد تہہ تیغ ہوئی کئیوں نے خوف وہراس میں جان کی بھیک مانگ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ باقی چند لوگ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر راہ فرار اختیار کر سکے۔ احمد بن بُویہ کو شدید زخمات آئے اس کا دایاں ہاتھ اور بائیں ہاتھ کی چند انگلیاں کٹ گئیں۔ اور لاشوں کے انبار کے درمیان زخمی ہو کر پڑا رہا۔ اسی بناء پر وہ بعد ازاں عقتہ (یعنی ہاتھوں سے معذور) کے نام سے مشہور ہوا۔ جب یہ خبر جیرفت پہنچی تو کوردبیر اور اس کے دیگر ساتھی جنہوں نے جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا، شہر سے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ صبح سویرے ابن کلّاوبی

اور اس کے لوگوں نے لاشوں کے انبار سے ابوالحسین احمد کی تلاش شروع کردی اور زندہ ڈھونڈ نکالا۔ جب کہ دوسرے سب مر چکے تھے[1]۔ ابوالحسین احمد کو جیرفت لے جایا گیا۔ ابنِ کلاویہی نے اس کا علاج معالجہ کرایا۔ اور کماحقہٗ اس کی تیمارداری میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اس کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ علی بن بعُویہ کو ان واقعات کا حال سُن کر شدید صدمہ پہنچا۔ وہ جنگ کرنے کا بالکل خواہاں نہ تھا مگر دیلمی خاندان کا وقار تو اب آناً فاناً مٹی میں مل چکا تھا۔ اس نے مسلّمہ بدفطرت، بدسرشت اور قالین نشین درباری شیر "کوردبیر" کو گرفتار کر کے زینت زندان بنا دیا۔ خفت مٹانے اور گرتے وقار کو سہارا دینے کی خاطر ابوالعباس اور اپنے وزیر قُتلغ کو دو ہزار فوج دے کر، معزّ الدولہ ابوالحسین احمد بن بعُویہ کی شکست خوردہ تباہ حال باقی ماندہ فوج کی خبر گیری کے لئے سرجان روانہ کر دیا۔ ابنِ کلاّ ویہی نے زبانی اور تحریری طور پر علی بن بعُویہ کو پیغامات ارسال کئے اور گذشتہ واقعات پر معذرت کا اظہار کیا۔ اس نے اطاعت گذاری کی پیشکش کر کے تدبر و عقل مندی کا ثبوت دیا۔ اور ایک مرتبہ جو اس نے قول دیا تو اسے ہر وقت نباہا۔ اور اس پر پورا اترا۔ علی بن بعُویہ نے شیراز کے قاضی ابوالعباس ابوالفضل العباس کے پائے کے دیگر بلند مرتبت اور اعلیٰ نژاد آدمیوں کو ابنِ کلاّ ویہی کے پاس بطور سفیر بھیج کر اُس کے معذرت نامہ کو شرفِ قبولیت بخشا۔ معاہدے کی تجدید و توثیق کی گئی۔ ابنِ کلاویہی کو کسی قسم کے تحفظات سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس نے ابوالحسین احمد بن بعُویہ اور اس کے سپاہ دوست اور دیگر اسیران کو تمام اعزاز و اکرام کے ساتھ رہا کر دیا۔

ابوعلی بن عباس نے احمد بن بعُویہ کے المناک زوال کے بعد مہرِ سکوت توڑ ڈالا

۱۔ تجرباتِ اقوام۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۹۹

اور اس کی شدید خواہش دوبارہ جاگ اُٹھی۔ اس کی افواج کی سپاہیانہ جرأت وہمت خود کرآئی۔ صناعِ قدرت نے تو اسے کاشتکاری کے سانچے میں ڈھالا تھا مگر تقدیر نے اسکو بغاوت وانقلاب کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اس نے اپنی شدید خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے تیغِ آبدار تھام کر میدانِ کارزار کا رُخ کیا۔ اس نے سیستان سے کوچ کر کے کتاب کے علاقے میں پڑاؤ کیا۔ احمد بن بویہ اس کے مقابلے میں نکل پڑا اور دونوں دشمن افواج نے آپس میں گتھم گتھا ہو کر کئی دنوں تک میدانِ کارزار کو گرم کر کے انسانی خون سے لالہ زار بنا دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ آخر بڑی کُشت وخون کے بعد ابو علی زمین بوس ہو کر کھیت رہا۔ اس کی فوجیں تتر بتر ہوئیں اور اس طرح راہِ فرار اختیار کیا۔ جس طرح طوفانی موجیں طوفان تھم جانے کے بعد واپس پلٹ جاتی ہیں۔ فتح وکامرانی کے نشے سے سرشار احمد بن بویہ نے گزشتہ رسوائیوں کی داغ مٹانے اور بدلہ لینے کی خاطر، ابن کالادیہی کے خلاف معرکہ آرائی کی وہ اپنے دشمن کو سبق سکھانا چاہتا تھا مگر بدقسمتی سے اسے خود ہی سبق مل گیا اس نے تجربات سے سبق حاصل کئے بغیر اور جنگ کی نوعیت کا تجزیہ کیئے بغیر اپنی افواج کو بلوچ سردار کے خلاف جنگ میں جوت دیا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح کا عمل کرنے سے اپنے حسرت ناک زوال کا راستہ خود ہموار کر رہا ہے۔ ابن کالادیہی کو پیش آنے والے خطرے کی اطلاع مل گئی وہ مقابلہ کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ وہ اپنے لوگوں کو مسلح کر کے احمد کے لشکر کے بالمقابل اس مقام سے دو فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا جہاں سے اس کی افواج کا بلوچوں پر شبخون مارنے کا ارادہ تھا۔ بلوچوں کے سردار نے دشمن کے اچانک حملے کا انتظار نہیں کیا۔ اور اس نے بلا تامل پہل کر کے اپنی افواج کے ہتھیار بند سرفروشوں کو دشمن پر ناگہانی طور پر یلغار کرنے کی تاکید کر دی۔ دونوں مخالف ومتحارب فوجیں ایک دوسرے کے نہایت قریب آگئی تھیں۔ آخر کار معرکۂ کارزار گرم ہو گیا اور مخالف فوجیں ایک دوسرے کی صفوں میں اس طرح گھس کر خلط ملط ہو گئیں کہ انکی باہم کے بغیر ان میں امتیاز کرنا ناممکن ہو گیا۔ بلوچوں نے دیلمی افواج کو بے رحمی سے گاجر مولی کی مانند

کاٹ کاٹ کران کی کمر توڑ دی۔ اور ان کو مفلوج کر کے چھوڑا۔ اور پھر قطعی فیصلہ کن جنگ لڑنے کی خاطر وہ واپس چلے گئے۔ احمد بن بعویہ نے اپنی شرمندگی و خفت اور پریشانی کو چھپانے کی خاطر علی الصباح دشمن کا تعاقب کیا اور اس کے چند افراد کو قتل کر کے تلخئ کام و دہن مٹانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بھائی کے نام خط لکھ کر الیاس پر فتیابی اور بلوچوں کی تباہی کی اطلاع بھجوا دی۔ جواب میں علی نے اسے مزید پیش قدمی روکنے کی تاکید کر دی اور سرزبان بن خسرو جلیتی (JILITE) کو احمد کو واپس صدر مقام بلا لانے کے لئے بھیج دیا۔ احمد کی ناکامی و نامرادیوں کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ بلوچ علاقوں کو طاقت کے بل پر فتح کرنے کی اس کی امنگوں پر پانی پھر گیا۔ سانپ نکل گیا لکیر پیٹا کر کے بمصداق، محرومی و مایوسی کے سوا اس کی جھولی میں اب کچھ باقی نہ رہا۔ وہ بادلِ نخواستہ اپنے بھائی کے صدر مقام کو واپس چلا گیا۔ وہ بلوچوں اور ان کے سردار ابن کلادیہی کے خلاف اپنی نفرت و مخاصمت اور بغض و کینہ کو بھلا نہ سکا۔ ؎۱

۳۵۷ ہجری بمطابق ۹۶۸ء میں عدالدولہ کو کرمان کا واحد آقا و حکمران بننے کا شوق چرایا۔ اس نے فوجی شہرت اور نام و نمود کی خاطر صوبہ کے تمام دور دراز اضلاع کو زیرنگیں کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس دوران الیاس کے بیٹوں کے درمیان آپس میں نااتفاقی اور چپقلش پیدا ہوئی جن میں الیاسا نے اپنے والد کی روح کے قفس عنصری سے پرواز کرنے کے فوراً بعد خراسان کی راہ لی۔ ۳۵۹ ہجری میں عدالدولہ نے سلیمان محمد بن الیاس کی سرکوبی کے لئے جو خراسان میں مقیم تھا، قرقیر بن جستام کی زیر کمان ایک لشکر بھیجنے کا اہتمام کیا۔ موخرالذکر نے کرمان کو فتح کرنے کے لئے حاکم خراسان پر دباؤ ڈالا۔ بلوص (بلوچ) اور قفص پہلے ہی سے سلیمان کے ساتھ در پردہ ملے ہوئے تھے اور حاکم خراسان سے ایک

۱۔ تجربات اقوام۔ جلد اول۔ صفحات ۶۰۱ تا ۶۰۲

مضبوط اور ہتھیار بند دستہ فوج بھیج کر بکمالِ مہربانی اس کی اعانت کی۔ سلیمان نے بلوچوں اور قفصوں کو بعو یہ خاندان کے سربراہ، سلطان اعظم سے کی گئی بیعت سے پھرنے اور اطاعت نہ کرنے پر اُکسایا۔ قرقیر نے جیرفت اور بم کے درمیان دشمن کا مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد سلیمان کی منتخب فوج شدید حملوں کی تاب نہ لاکر کئی لاشیں میدانِ کارزار میں چھوڑ کر فرار ہوگئی۔ سلیمان اپنے بھائی الیاسا کے دو بیٹوں بکر اور حسین اور دیگر کئی خراسانی عمال کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آیا جن کے سر کاٹ کر عضدالدولہ نے شیراز اپنے بھائی رکن الدولہ کو بطور تحفہ ارسال کئے، تب منوجان قبیلہ اور باقی ماندہ بلوچوں نے جن میں بلوچ سردار ابوسعید اور اس کے اہل و عیال بھی شامل تھے اور دیگر قبائلی سرداروں نے آخری دم تک لڑنے کا عزمِ صمیم کر کے کمر کس لئے۔ عضدالدولہ نے عابد بن علی اور دیگر دو سپہ سالاروں کو انکی بغاوت کو پوری قوت سے کچلنے کے لئے قرقیر کی کمک کے لئے روانہ کر دیا۔ مخالف فوجوں کے درمیان بروز چہارشنبہ بتاریخ دس ماہ صفر ۳۶۰ ہجری (۱۳ دسمبر ۹۷۰ء) صف آرائی ہوئی۔ سازشی اور باغی نہایت بے جگری کے ساتھ پیدل اور گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑے مگر انتہائی کشت و خون اور تباہی و بربادی کے بعد ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پانچ ہزار آزمائے ہوئے سرفروش و جانباز گاجر مولی کی طرح کٹ مرے۔ ابوسعید بلوچ کے دو لختِ جگر فرزندان نے اس روز داعئ اجل کو لبیک کہا۔ ابوالفوارس منوجانی، اپنے بھتیجے ابواللیث اور دیگر کئی ممتاز سرداروں کے ساتھ گرفتار ہوا[1]۔ عابد بن علی شدید ضرب لگانے کے بعد باغیوں اور سازشیوں سے سخت تر انتقام لینے کی خاطر ان کے علاقے میں اندر گھس گیا۔ وہ ان کے پورے علاقے کے لئے آفتِ عظیم اور خطرہ بلاخیز بن کر داخل ہوا اور ان کے کئی آدمیوں کو قتل کر دیا۔ ہرمز پر قبضہ جمایا گیا۔ تیز کو تاخت و تاراج کیا گیا، اور بیز (کیچ) کو

۱۔ تجربات اقوام۔ جلد دوئم صفحہ ۳۲۰

اپنے پرانے حاکم سے چھین لیا گیا۔ اس طرح بغاوت کی ہولناک شدید آگ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ عدد الدولہ نے بذاتِ خود، وحشت و بربریت کا ایک ایسا عملی مظاہرہ کیا جس کے لئے اب تک ایک اداکار، پردۂ سیمین اور منظر کی ضرورت درپیش تھی۔ اس کو مطلع کیا گیا کہ کچھ بلوچوں کے گھر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں اور آنک رسائی کا واحد راستہ ایک تنگ اور دشوار گذار درہ سے ہو کر جاتا ہے جہاں ایک چھوٹا سا دستہ بھی اچھی طرح مسلح ایک بڑی فوجی جماعت کو کامیابی سے روک سکتا ہے۔ ان کو زیر کرنا ناممکن پا کر عدد الدولہ نے ایک دلچسپ اور مکارانہ چال چلا۔ اس نے ان بلوچوں کو ایک پیغام روانہ کیا کہ جب تک وہ اس کو نذرانۂ عقیدت پیش نہیں کریں گے، وہ ان کو کبھی نہیں بخشے گا۔ بلوچوں نے جواب دیا کہ "ان کے پاس کوئی رقم نہیں ہے"۔ اس نے کہلا بھیجا: "ہم لوگ شکاری ہیں۔ مجھے ہر خیمہ سے ایک کتا چاہیئے"۔ بلوچوں نے اس مطالبہ پر زیادہ سوچ بچار نہیں کیا اس نے اپنا ایک نمائندہ ان کے پاس بھیجا تاکہ وہ خاموشی سے ان کے تمام خیموں کی گنتی کر لے اور اسی تعداد کے مطابق کتے مانگ کر لائے۔ اس طرح لائے گئے ان تمام کتوں کو درّے کے سرے پر جمع کیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ تمام کتوں کے گلے میں نفط کے حلقے ڈالے جائیں۔ اور اس نفط کو آگ دکھائی گئی۔ تمام کتوں کو بیک وقت چھوڑ دیا گیا اور فوج کو ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ کتے آگے کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے اور لوگ خبردار ہو گئے کہ فوج ان کے خلاف حرکت میں آ گئی ہے۔ وہ فوراً درّے میں داخل ہو گئے تاکہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ لیکن وہاں ہر کتے نے جلتی ہوئی آگ سے بچاؤ کی خاطر اپنے اپنے مالک کے پاس پناہ لینے کی کوشش کی۔ ہر کتا اپنے مالک سے چمٹ چمٹ کر اپنے کو اس سے رگڑتا رہا۔ اور یوں ہر شخص کو آگ لگ گئی۔ انہوں درّے کو خالی کر دیا اور کتے بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ ان میں سے کئی جل کر مر گئے اور کئی مفلوج و معذور ہو گئے۔ پھر کتے جا کر اپنے اپنے خیموں کے ساتھ چمٹ گئے جن کو ان کے مکینوں

نے خالی کر دیا تھا دوسری طرف فوج ان کے تعاقب میں چل رہی تھی تاکہ ان کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے اس عام تباہی نے مکمل دہشت پھیلا دی۔ تمام سرکش قبائلیوں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اور پُرامن رعایا کے طور پر رہنے کا وعدہ کر لیا۔ مختصر وقفے کے لئے لوگوں نے امن و امان کا سانس لیا چند مہینوں کی خاموشی کے بعد بلوچ پہاڑی جوان قبائل میں سب سے زیادہ جرأت مند، وحشی اور بربریت کی طرف مائل تھے انہوں نے اپنی عادت کے مطابق رہزنی کرنا اور معصوم لوگوں کا خون بہانا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر غلط راہ اختیار کی اور مضافات و نواحی علاقوں میں دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ تمام علاقے میں خوف و ہراس اور تباہی و بربادی پھیل گئی کرمان سیستان اور خراسان کی جانب جانے والی تمام شاہراؤں پر تمام لوگوں کو انکے ہاتھوں بلا امتیازِ ذات و عقیدہ، زک پہنچا۔ عضدالدولہ نے مختلف جگہوں سے فوجیں جمع کیں اور ۲۶ اگست ۹۷۱ء کو باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا جب وہ سرجان پہنچا تو اس کو اطلاع ملی کہ بلوچوں نے سُرخ پرچم لہرایا ہے اور خونریز جنگ لڑنے کے لئے تمام تیاریاں کر لی ہیں اور اپنے سردار علی بن محمد بریزی کی زیرِ قیادت پورے ضلع کو تاخت و تاراج کر دیا ہے، اس نے عابد بن علی کی سرکردگی میں دیلمی، جیلٹی (JiLiTE) ترک، عرب، کُرد، زط (جت) اور سیف الدولہ کے تجربہ کار جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوج ترتیب دے کر اسے بلوچوں کے خلاف روانہ کر دیا۔ بلوچ حملہ آور فوج کی بھنک پا کر منتشر ہو گئے اور انہوں نے اپنے مضبوط پہاڑی قلعہ بندیوں کو جانے والے تنگ راستوں میں مورچے سنبھال لئے۔ عابد نے اپنے بھائی کی زیرِ قیادت ایک مضبُوط دستہ بھیجا تاکہ ان کو عقب سے گھیرے میں لے اور خود

---

۱. تجرباتِ اقوام - جلد دوئم . ص ۳۲۰

بریز پہاڑیوں کی طرف بڑھ گیا جو بلوچوں کی پناہ گاہیں تھیں۔ اس نے اس علاقے میں زبردست چڑھائی اور یلغار کی اور محمد بن بریزی کے داماد ابو درم کو گرفتار کر کے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ بلوچوں نے خفیہ جماعتیں اور خبر رساں، جاسوسی کے لئے بھیج دیئے تھے۔ مگر دیلمی سپہ سالاران سب کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اِس دوران میں فوج نے موقع پر پہنچ کر پورے علاقے میں پہاڑی دروں اور راستوں پر تنگ گھیرا ڈال کر ان کی ناکہ بندی کر دی۔ جنگ ناگزیر ہو گئی۔ بلوچوں نے اپنے بہترین تیغ زنوں اور سورماؤں کو جمع کیا۔ جو پُرعزم تھے کہ یا تو فتح و نصرت انکے قدم چومیگی یا وُہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کریں گے۔ طلوعِ صبح سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہر حملے کا دندان شکن جواب دیا گیا۔ بلوچوں کو ہر طرف موت و تباہی کا سامنا تھا۔ نہایت سخت مقابلے کے بعد باغیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پسپا ہو گئے۔ ان کا سردار آب الرّجال بلوچ، دوسرے رہنماؤں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ گیا۔ آخر کار وہ گرفتار ہُوا اور تلوار سے ان کے سر قلم کئے گئے۔ صرف چند افراد کو من مانی شرائط منوا کر ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا اور ان کے مال و جان کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا[1]۔ عدد الدولہ نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ بریز پہاڑیوں سے بلوچوں کو ہٹایا اور ان کی جگہ دوسرے پُرامن قبائلیوں کے کاشتکار آباد کئے۔

بلوچوں کی لوٹ مار اور دہشت گردی نے ایک سے زائد مرتبہ غزنی کے شاہی دربار کو چوکنا کر کے اس کی توجہ ان کی جانب مبذول کر دی تھی۔ اسوقت سیستان اور کرمان کے درمیان بغاوتوں، سرکشیوں اور غدّاری کی جتنی بھی سازشیں پھیلیں اور فتنوں نے سر اُٹھایا۔ ان سب میں بلوچوں کا ہاتھ تھا اور وہی ان کے ذمّہ دار تھے۔

۱۔ تجرباتِ اقوام جلد دوئم صفحات ۳۲۲ تا ۳۲۳

حتیٰ کہ سلطان محمود نے جب کرمان کے حاکم کے پاس کچھ تحائف اپنے سفیر کے ساتھ روانہ کئے تو اس کو بھی نہیں بخشا گیا۔ طبّاس اور خابس کے درمیان بلوچ لٹیروں کے ایک جتھے نے سلطان کے سفیر کو پکڑا۔ سفیر اور اس کے سب ہمراہیوں کو خوب لوٹ لیا۔ سفیر واپس چلا گیا اور سلطان سے اس وقت ملاقات کی جب کہ وہ خوارزم کے سفر پر تھا۔ بست کے مقام پر اس کا لڑکا مسعود، ہرات سے آکر اپنے والد سے ملا۔ سلطان نے ایک مضبوط دستہ دے کر اسے روانہ کر دیا تاکہ وہ ان شوریدہ سر اور بد دماغ لٹیروں کی سرکوبی کر کے ان کے دماغ درست کر دے۔ اس نے بلوچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دست بدست سخت لڑائی ہوئی۔ بلوچوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے چالیس آدمی کام آئے اور اتنے ہی گرفتار ہو گئے۔ مسعود کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ شادان فرحان و کامران واپس ہوا[1]۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لئے کئی مرتبہ لشکر کشی کی مگر پھر بھی وہ لوٹ مار سے باز نہ آئے اور اپنی شیطانی عادت ترک نہ کی۔ جب کہ سلطان مسعود عراق میں تھا، اس کو بلوچوں کی دہشت گردی کی متعدد وارداتوں کی اطلاع دی گئی۔ ان کو لوٹ مار کی قیمت جلد ہی اپنے خون سے ادا کرنا پڑی۔ سلطان نے راستوں کو ان عادی لٹیروں اور راہزنوں سے پاک کرنے کے لئے ایک دلچسپ چال چلی۔ زہر آلود سیبوں سے لدا ہوا ایک کاروان قصداً صحرائے کرمان کے راستے روانہ کیا گیا۔ بلوچوں نے کاروان پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح سیبوں پر جھپٹ پڑے۔ زہر نے اپنا کام کر دکھایا اور ایک متعدی وبا کی مانند بڑی تعداد میں ان لوگوں کا صفایا کر دیا[2]۔

۱۔ جامع الحکایات از نورالدین عدنی ایڈیشن دوئم۔ صفحات ۱۹۳-۱۹۴

۲۔ " " " " ۱۹۳-۱۹۴

کرمان سے سیستان، ایرانی بلوچستان اور مکران تک

دسویں صدی کے آغاز میں کرمان سے سیستان اور ایرانی بلوچستان کی جانب بلوچوں کا پہلا بڑا طوفانی انخلاء وقوع پذیر ہوا۔ کرمان کا صوبہ، عربوں کے ایران فتح کرنے سے لے کر بارہویں صدی کے وسط تک ان کا سب سے بڑا مرکز زاد و بوم رہا۔ سیستان میں انہوں نے کوئی مرکزی کردار ادا نہیں کیا اور نہ ہی کوئی اہم کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ملک کے امن و امان اور سیاسی حالات کو بہت کم متاثر کیا۔ تیمور برلاس نے اپنی اوائل زندگی میں، جب اس نے عالمِ شباب میں قدم رکھا تو سیستان کے بلوچوں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں۔ ایک معرکے میں تو اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کے ایک پیر پر شدید زخم آئے جس کی بناء پر وہ زندگی بھر ہمیشہ کے لئے لنگڑا ہو گیا۔ اس طرح نصف ایشیا کے فاتح کو جس کی چشم و ابرو کے معمولی اشارے پر پوری دنیا لرزہ براندام ہو جاتی تھی، تیمور لنگ کے نام سے تاریخِ عالم میں مشہور و معروف ہونا پڑا۔[1] الاصطخری (۳۴۰ ہجری بہ مطابق ۹۵۱ عیسوی) کی تحریر کے مطابق اس کے دور میں سیستان کے دو صوبے بلوچی خطے کے طور پر مشہور تھے۔ مشہور وقائع نگار عثمان لکھتا ہے کہ وہ سیستان میں ایک جگہ موسومہ بہ گنبد بلوچ ٹھہرا۔[2] وہ سیستان سے آہستہ آہستہ افغانستان کے علاقے گرم سیر کی جانب حتیٰ کہ شوراوک کی طرف جنوبی جانب تک بڑھتے پھیلتے چلے گئے اور وادی ہیلمند میں فرح تک سیلِ رواں کی مانند

۱۔ Vambery, Geschichte Bochara's order Transoxaniens, Stuttgart, 1872.

۲۔ طبقات ناصری۔ از منہاج الدین عثمان بن سراج الدین

پھیل کر چھا گئے۔ تیرھویں صدی کے عشرۂ اول میں، کوچ و بلوچوں کو گرم سیر کے علاقے میں ہرمز۔ کے امیر تاج الدین شہنشاہ کے اتحادی کے طور پر سکونت پذیر بتلایا گیا ہے۔ ہجرت وانخلا کی لہر شمال جانب، ہرات، بادغیس اور افغانستان زمین داور ولایت کی طرف بڑھتی گئی حتیٰ کہ انہوں نے اس سے آگے بڑھ کر روسی ترکستان میں اپنی نو آبادیوں کا جال بچھا دیا۔ معین الدین ملقب بہ زمجی الاصفظاری[1] (۱۴۹۱ء) کے مطابق ہرات کے شمالی جانب بادغیس کے قرب وجوار کے علاقوں میں تیرھویں اور چودھویں صدی میں خانہ بدوش اور مستقل آبادی میں بلوچوں کی بکثرت تعداد تھی۔ وہ آج تک افغانستان کے ہرات، فرح، گرم سیر، چکنسور اور شوراک کے خطوں کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں۔ ہرات کی چودھویں صدی کی تاریخ میں بلوچوں کا کردار کم اہمیت کا حامل نہیں۔ وہ ہرات کے اس وقت کے کرت حکمرانوں کے اتحادی تھے۔ وہ ان کی بہادر اور سرفروش فوج کے روح رواں[2] تھے۔ بلوچوں نے اپنے سردار شاہ بلوچ کی زیر قیادت منگولوں کو بھی لوہے کے چنے چبوائے۔ جنہوں نے اس تہذیب و تمدن کو تہہ و بالا کر دیا تھا جسے اسلام نے ایک پر شکوہ اور شاندار شکل و ہیئت دی تھی اور جو چھ صدیوں سے زائد عرصہ تک قائم رہا۔ جنہوں نے اقصائے عالم کی طاقتور اقوام کو تباہی و بربادی کے نذر کر دیا تھا اور عظیم سلطنتوں کے مراکز کو صفحۂ ہستی سے مکمل نیست و نابود کر ڈالا تھا۔

ایرانی بلوچستان میں بلوچ زرخیز علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور چند

۱۔ ملاحظہ ہو۔ روضۃ الجنات فی الاوصاف الہرات

۲۔ بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ، از:۔ محمد سردار خان، صفحات ۵۲-۲۵۴

تاریخ نامۂ ہرات۔ از: سیف بن محمد بن یعقوب الہروی۔ مرتبہ: پروفیسر محمد زبیر، صفحات ۹۶ - ۶۹۷

قبائل موجودہ پردم کے راستے مکران کی جانب آگئے اور پنجگور تک بڑھتے چلے گئے جو بقولِ المقدسی، دسویں صدی میں مکران کا صدر مقام تھا، لے سٹرینج (LE STRANGE) ولایت مکران کے بارے میں بحث کرتے ہوئے عرب جغرافیہ نویس اور وقائع نگار المقدسی کے حوالے سے رقم طراز ہے: "بنجبور (پنجگور) میں مقدسی کے مطابق مٹی سے تعمیر شدہ ایک قلعہ تھا جسے ایک خندق کے ذریعے تحفظ دیا گیا تھا اور شہر کے اردگرد نخلستان واقع تھے۔ شہر کے دو دروازے تھے۔ بابِ تیز جنوب مغرب کی طرف کھلتا تھا جہاں سے تیز کا راستہ جاتا تھا۔ اور بابِ توران شمال مشرق کی سمت کھلتا تھا جہاں سے اسی نام کے ایک ضلع کو راستہ نکلتا تھا جس کا صدر مقام قزدار تھا۔ شہر کو پانی فراہم کرنے کے لئے ایک چشمہ تھا اور جامع مسجد عام منڈی میں واقع تھا گو کہ مسلمان وہاں صرف غیر مہذب بلوی (بلوچی) تھے جن کی زبان ایک خلط ملط شدہ مبہم بولی تھی۔"[1]

مکران سے سندھ اور پنجاب تک :

دسویں صدی عیسوی میں پنجگور میں آباد ہونے کے کچھ عرصہ بعد، بلوچوں کی فوجِ ظفر موج، پرکشش سندھ کی جانب متواتر بڑھتی چلی گئی۔ جہاں کی زمین نہایت زرخیز، پانی وافر، گرمیاں خوشگوار اور سردیاں کم اور قابلِ برداشت ہیں۔ اُس وقت سے بلوچ زرخیز سندھ میں آزادی کے ساتھ بلا روک ٹوک بکثرت داخل ہونے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور یہاں ان کو ان دیگر اجنبی علاقوں کی بہ نسبت اپنا مستقبل

۱۔ مشرقی خلافت کے علاقے (THE LANDS OF EASTRN CALIPHATE)

از :۔ G. LE STRANGE۔ صفحہ ۳۲۹

مقابلتاً زیادہ خوشگوار اور بہتر نظر آیا جہاں انہوں نے بے پناہ مصائب، اضطراب، افراتفری، شورش اور ہنگاموں میں عمریں گزار دی تھیں۔ وہ سندھ میں سومرووں کے دورِ حکومت میں داخل ہوئے جن کی نسلی ارتقاء و منابع کی تفاصیل نہایت محدود ہیں[1]۔ سومرہ کون ہیں اور یہاں کب وارد ہوئے؟ یہ سوالات، تاریخ میں معمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سومروؤں کا شاہی خاندان اُس وقت ایک تاریخی بھونچال کا شکار تھا جب بلوچ ان کے سیاسی منظر پر ظاہر ہوئے۔ اور ہمارے پاس ایسی کوئی ہمعصر تاریخ اور ایسا ذریعہ نہیں جس میں سومروں اور ان کے جانشین سمّوں کی حکومت کے بارے میں کوئی جامع و مفصّل تذکرہ موجود ہو۔ ہم میر معصوم کی پیروی کریں گے جو لکھتا ہے۔ کہ "میری نظر میں کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں سومروں اور سمّوں کے حالات کا تفصیلی ذکر ہو۔ لہٰذا میں نے ان سب کا خلاصہ تحریر کر دیا ہے[2]"۔ سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں ایک خود سر نوجوان، سومرہ ولد چندر کو، جس کی قسمت و تقدیر نے یاوری کر کے عظمت سے نوازا، سندھی شرفا نے سندھ کے تخت پر بٹھا دیا تھا اور تمام فرقوں اور طبقوں کے لوگ، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے، اس کے مطیع و اطاعت گزار بن گئے تھے۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا بھگر[3]، سندھ کے تخت و تاج کا مالک بنا جو بلند و بانگ دعوے اور وعدے کرنے کا عادی تھا مگر عمل سے مبرّا تھا۔ اسکا جانشین اس کا بیٹا دودا اوّل بنا جس نے نصرپور تک کے علاقے کو اپنے قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس کا بیٹا سِنگھر اس کا جانشین بنا۔ وہ شان و شوکت اور عیش و عشرت کا گرویدہ تھا۔

۱۔ اس ضمن میں قارئین ملاحظہ کریں۔ عرب و سند کے تعلقات، از: سید سلیمان ندوی، صفحات ۶۔ ۳۷۰

۲۔ تاریخ سندھ، از: محمد معصوم، مترجم میجر گریول مالٹ جو ۱۹۴۸ء میں خیرپور کا ریذیڈنٹ تھا۔ صفحہ ۵۸

۳۔ تحفۃ الکرام کے مصنف نے اس کا نام بھنگر بتلایا ہے۔

اسکے بعد پتھو سریر آرائے تخت ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا خیرا تخت پر بیٹھا۔ خیرا کی وفات پر خفیف تخت و تاج کا وارث بنا۔ خیرا اور خفیف دونوں ایک ہی طرف کے تھے۔ خفیف کے دورِ حکمرانی میں بلوچوں نے سوڈھاؤں اور جھریجوں سے مل کر سازش کی اور بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ خفیف نے ان اتحادی اور متحدہ قبائل کو عبرتناک شکست دینے کی خاطر لشکر کشی کی۔ مگر بلوچ سردار مہران اور رتن مل سوڈھا نے مزاحمت کئے بغیر سفید پرچم لہرایا اور بڑے نذرانے پیش کئے۔[1] اس طرح سومرہ حکمرانوں نے اس خوامخواہ کی مہم سے چڑھائی کئے بغیر اپنی فوجوں کو واپس کیا۔ خفیف کے بعد دودا دوئم سندھ کا مالک بنا۔ اس کی فوتیدگی کے بعد اس کا بیٹا عمر تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اس مشہورِ زمانہ حکمران کی بہادری اور ہیبت کی دھاک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ظلم و تشدد، فریب کاری ریاکاری اور دغابازی میں یکتائے روزگار تھا اور شہرتِ دوام رکھتا تھا۔ اسکی لاپرواہی عیش کوشی اور آرام پرستی خود اس کے لئے سوہانِ روح کا باعث بنیں اور اسکے لیے مصیبت کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ سمہ، سوڈھا، جت اور بلوچ قبائل نے بغاوت کر دی عمر نے دشمنوں کے اتحاد کے خلاف پیش قدمی کر دی۔ خوش قسمتی سے، طاقت و قوت کے مقابلے میں بخت و طالع نے یاوری کی اور وہ بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسکی روح بمقام تھوہر، قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔[2] یہ واقعہ غالباً سلطان مسعود (۱۰۳۰ - ۱۰۴۱ء) کے دور کا ہے۔ فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ عمر کا لڑکا دودا سوئم اپنی نوجوانی کے زمانہ میں غزنی فرار ہوا تھا اور سلطان مودود (۱۰۴۱ - ۱۰۴۹ عیسوی) سے اپنے سرپرست چُھتر کے خلاف کمک کا طالب ہوا تھا جس کے بارے میں اس نے، تخت و تاج پر قبضہ کرنے کی

---

۱. تاریخ سندھ از: میر معصوم، مترجم: میجر جی. جی. مالٹ صفحہ ۴۱

" " " " " " " ۴۴

سازش تیار کرنے کے متعلق شک وشبہ کا اظہار کیا تھا۔[۱] بلوچوں کی بغاوت دودا سوئم کے والد عمر کے زمانے کا واقعہ ہے۔ جو سلطان مسعود کا ہمعصر تھا۔

تیرھویں صدی کے نصفِ اول کے اختتام کے بعد سندھ سے بلوچ قبائل کا ایک سیلابِ بلاخیز، بہاولپور کے ساتھ ساتھ امنڈتا چلا گیا اور ملتان کے نواحی علاقوں میں آباد ہو گیا۔ ۱۲۸۰ء اور ۱۲۸۶ء کے دوران، سلطان غیاث الدین بلبن کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں بلوچ مستقل طور پر ملتان کے مضافات میں آباد ہو گئے تھے۔ ۱۳۲۹ء میں سلطان محمد بن تغلق کے دورِ حکومت کے دوسرے سال ملتان کا والی بہرام ایبہ[۲] (Ai BA) نے سنہرے خواب دیکھ کر ملتانیوں اور بلوچوں کو جمع کر کے بغاوت کا سُرخ پرچم بلند کیا۔ اس وقت محمد بن تغلق اپنے غدار اور بدسرشت چچازاد بھائی بہاءالدین گرشاسپ کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ مگر سلطان نے اس بغاوت کو بہ نفسِ نفیس کچلنے کا فوراً آہنی عزم کر لیا۔ اس نے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں اور ایک ناقابلِ تسخیر مضبوط فوج ترتیب دی۔ یہ طاقتور فوج اس کی ذاتی قیادت میں شورش پسندوں کا قلع قمع کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔ چند روز کے تھکا دینے والے مسلسل سفر کے بعد اپنی منزلِ مقصود کو پہنچا۔ اور مزاحمت پر آمادہ شہر کو سبق سکھانے کے لئے اس نے تلوار سونت لی۔ ہلاکت خیز لڑائی کے بعد

۱۔ تاریخِ فرشتہ۔ صفحہ ۴

فرشتہ اور میر معصوم، دونوں نے سلطان کا نام مودود کے بجائے سہواً امندود لکھا ہے۔

۲۔ میر معصوم نے اپنی تاریخ میں صفحہ ۳۲ پر اس والی کا نام خسرو خان لکھا ہے۔ مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تاریخِ سندھ صفحہ ۱۹ پر کشور خان کو سندھ اور ملتان کا والی بتلایا ہے۔

باغی فوج کی قوتِ مزاحمت جواب دے گئی۔ ان کو سورج غروب ہونے تک مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا رہنما سپاہیانہ موت مرا اور ملتان کے باسی غم و یاس میں اپنے مستقبل کے لئے متفکر نظر آتے تھے۔ سلطان نے ملتانیوں کے خون کا دریا بہا دینے کا حکم صادر کر دیا[1]۔ لیکن مشہورِ زمانہ ولی اللہ شیخ رکن الدین کی بروقت مداخلت نے سلطان کے قہر اور غیض و غضب سے ملتانیوں کی جانیں بچالیں۔ کرمان سے بلوچوں کی ہجرت کا آخری منظر کرمان کے سلجوقیوں کے زوال کے آخری سالوں میں نظر آتا ہے۔ مورخ احمد علی خان بیان کرتا ہے کہ طغرل شاہ کے بعد، ارسلان شاہ اور بہرام شاہ نے ملک کو تقسیم کر دیا تھا۔ ارسلان شاہ کے حصے میں بردشیر، جیرفت، خابس اور بہرام شاہ کے حصے میں بم اور مکران کے علاقے آئے۔ کرمان اور مکران کے آخری سلجوقی حکمران محمد شاہ (۵۸۳ ہجری بمطابق ۱۱۸۷ء ۱۱۸۸ء) اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔ بلوشاہی کے تمام اوصاف سے عاری اور مسخرہ حکمران ارسلان شاہ کے دورِ حکومت میں، بلوچوں نے اپنے سردار جلال خان کی سرکردگی میں سرجان اور خابس کے علاقوں اور صحرائے لوط سے مجتمع ہو کر کرمان اور اس کی طوفان آمیز تاریخ کو خیرباد کہا۔ اسی سردار سے ہی بلوچ نسل کے روایاتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اسکی سربراہی میں اس نسل نے ایرانی بلوچستان کی جانب حرکت کی اور بمپور کو اپنا روایاتی مرکز بنالیا۔ امیر جلال خان نے عزّ و وقار کے ساتھ وہاں مختصر عرصہ تک بیکار رہنے کے بعد چالیس قبائل (بولک) کے طاقتور جم غفیر کی قیادت کر کے صفاری حکمرانوں کے ماتحت علاقہ سیستان کی جانب کوچ کیا۔ اگر ہم بلوچی روایات پر اعتبار کریں تو ان کو ملک شمس الدین نے جلاوطن کیا تھا۔ غالباً یہ وہی حکمران ہے جس کا ذکر صفاری خاندان کے سلاطین کے سلسلے میں ملک شمس الدین کے نام سے آیا ہے[2]۔ وہ ملک تاج الدین بن ابو الفتح بن طاہر بن محمد

۱۔ تاریخِ سندھ از میر معصوم، مترجمہ جی جی مالیٹ صفحہ ۳۲
۲۔ طبقاتِ ناصری ملاحظہ کریں۔

کا بیٹا اور جانشین تھا اور اس وقت تخت پر جلوہ افروز ہوا جب ۵۵۰ ہجری میں اس کے والد نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ وہ ایک شتاب کار، اور بے اعتبار شکی المزاج بادشاہ تھا اور خون کا پیاسا۔ شقی القلب آمرِ مطلق تھا۔ اسلئے وہ جلاد کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اور اپنے لقب "ملک الناقص" سے بھی مشہور تھا۔ اس نے اپنی خون آشامانہ مزاج شقی القلب طبیعت کے باعث اپنے خاندان اور رعایا پر بے انتہا مظالم روا رکھے۔ اور اس نے مبیّنہ طور پر اپنے والد کے دیگر اٹھارہ بیٹوں اور سیستان کے کئی شرفا کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اس نے اپنے بھائی عزّ الملک کو بھی نورِ بصیرت سے محروم کر دیا۔ وہ اپنے عہد کا بدترین بادشاہ تھا۔ وہ حرص و طمع کی خاطر ظلم و تشدد کو روا رکھتا تھا۔ عیش و عشرت میں تمام ناجائز حربوں اور ذرائع کو جائز اور درست سمجھتا تھا۔ قابلِ نفرت حد تک مطلق العنان تھا۔ بلا سوچے سمجھے اور جلد بازی میں فضول، بے سود اور بے معنی اصلاحات کا نفاذ کرتا تھا جن کوئی ارزش اور قدر و قیمت نہیں ہوتی تھی۔ خون آشامی اور قتل و غارت گری پر استوار بنیادیں نہ تو محفوظ ہوتی ہیں اور نہ ہی دائمی۔ جو بھی اپنی شان و شوکت اور سلامتی و عافیت کا بیج، خون آشامی اور شقاوت میں بوتا ہے، اس کا ثمرہ بھی بعد ازاں اسے اسی دنیا میں ملتا ہے۔ چنانچہ بعد میں اس کو بھی اسی کے عمالِ کار ہی نے قتل کر کے اسے اس کے کئے کا مزہ چکھایا اور اس کے اندھے بھائی عزّ الملک کو تخت پر بٹھایا۔ ۵۶۱ ہجری سے کچھ عرصہ قبل اس کا بیٹا ملک تاج الدین اپنے باپ کی رحلت پر بادشاہ بنا[۲]۔ بہادر اور جنگجو ہونے کے باعث، ملک

۱۔ سیستان۔ اس ملک کی تاریخ، ارضیاتی ساخت و ہیئت، آثارِ قدیمہ اور لوگوں کے بارے میں ایک یادداشت از جی۔ پی۔ ٹیٹ، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس، ایف۔ آر۔ جی۔ ایس۔ سروے آف انڈیا، حصہ اول تا سوئم۔ صفحہ ۲۷۔

۲۔ ملاحظہ ہو۔ تاریخ احیاء الملوک۔

تاج الدین کے نام کے ساتھ "حرب" کا لقب بھی مشہور ہوا۔ اس کا خوشحال دورِ حکومت تقریباً ساٹھ سال تک رہا[1]۔ ملک تاج الدین نے اندھا ہونے کی بناء پر اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین عثمان کو اپنا قائمقام مقرر کر دیا تھا۔ شمس الدین سے پہلے اور بعد کے تمام ملک حکمران، فیاض، مدبر اور انتہائی با اصول انسان تھے۔ اس لئے یہ قیاس غالب ہے — کہ شمس الدین کے ساتھ ہی بلوچوں کے تعلقات کشیدہ اور ناخوشگوار رہے جس کی بناء پر وہ سیستان کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے ربیع الاول میں اس نسل نے وسیع پیمانے پر امیر جلال خان کی اولاد میں سے ایک امیر شیہک کی سربراہی میں مکران کی جانب ہجرت کی۔ امیر شیہک سردار اعظم امیر چاکر رند کا والد تھا۔

یہ ایرانی بلوچستان سے اس ملک کی جانب ان کا آخری انخلاء ہے جو ان کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ طاقتور رندوں نے مکران میں کولواہ کو اپنا مرکز بنالیا — پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر اور سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں، مکران سے لے کر کچھی کے میدانوں تک کا پورا علاقہ ایک خالص نو آبادی نظر آتی ہے۔ دو ہزار سال کی مدتِ مدید اور عرصۂ طویل کے بعد بلوچوں کی بڑی قوم کو، ایک فردِ واحد، امیر چاکر کی زیرِ قیادت اور سربراہی میں پہلی مرتبہ منظم اور متحد ہونا نصیب ہوا۔ جس کی بناء پر ان کا نام تاریخِ عالم میں، شہرتِ دوام کا حامل رہے گا۔ انہوں نے بلوچستان کے گوشے گوشے میں اس نسل کو پھیلایا۔ اور سولہویں صدی کے عشرۂ اوّل میں انہوں نے بلوچ قبائل کے جمِ غفیر کے ساتھ پنجاب اور ڈیرہ جات کا رُخ کیا۔ اس طرح بلوچی مہاجرت کی تاریخ کا طویل، مشکلات سے بھرپور اور تکلیف دہ باب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور پوری نسل اسی خانہ بدوشانہ زندگی اور ہجرت کی چہل قدمیوں اور آسیابی گردشوں کے

۱۔ طبقاتِ ناصری۔ مترجمہ: میجر ریورٹی صفحہ ۱۹۳

مصائب و خامیوں سے پاک و صاف ہو گئی جس نے صدیوں تک اس نسل کو اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑ رکھا تھا ایٹم کے موجودہ میں، بلوچ نسل کے لوگ، ایک ایسے خطۂ ارض پر قابض و متصرف و آباد ہیں جو شرقاً غرباً کرمان (ایران) سے مظفر گڑھ (پنجاب) تک اور شمالاً جنوباً ہیلمند (افغانستان) سے بحیرۂ عرب تک پھیلا ہوا ہے[1] جو بلحاظِ رقبہ اٹلی، یونان، سوئٹزرلینڈ، بلجیم اور ہالینڈ کے مجموعی رقبے سے بڑا ہے

مدائنِ خمسہ :

مدائنِ خمسہ یعنی بابل، بمپور، کیچ، گنداوہ اور سبی (سیوی) کا قدیم، وسطی اور جدید تاریخ کے مختلف ادوار میں بلوچوں کی حشر سامانیوں سے بھرپور اور طوفانی تاریخ کے ساتھ قریبی ربط و تعلق رہا ہے۔ یہ پانچوں شہر متعلقہ ازمنہ میں بالترتیب اس نسل کی آماجگاہ رہے ہیں۔ ان شہروں کو اپنی جس عظمت و جلال، اور شان و شوکت پر کبھی ناز رہا وہ بلوچی تاریخ کا ایک عظیم اور درخشاں باب ہے۔

بابل :

بابل کو قدیم شہروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اور موجودہ شہر حِلّہ کے عین شمال میں دریائے فرات کے کنارے واقع تھا۔ عموری شہنشاہ حمورابی (۱۹۴۸، ۱۹۰۵ ق م) کے دور میں، وہ سلطنت بیبولینا (BABYLANIA) کا صدر مقام تھا۔ بابل کی تاریخ دراصل میسوپوٹیمیا کی تاریخ ہے۔ قدیم تاریخ کے تمام ادوار میں وہ پورے مشرقِ وسطیٰ کا قابلِ فخر عروس البلاد تھا اور مستقبل کی تہذیب و تمدن کے مراکز کا ایک اعلیٰ تہذیب عمدہ اور مثالی نمونہ تھا۔ بابل ہی سے "ہلالِ زرخیز" کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چار دانگ

۱۔ ملاحظہ ہو۔ ایران اور مسئلہ ایران از: لارڈ این۔ کرزن جلد دوئم صفحہ ۲۵۵

(PERSIA AND PERSIAN QUESTION)

شرق و غرب میں پھیل گئی اور مصری و ایرانی تمدنوں کو جلا بخش کر بارِ دیگر انکی نشوونما اور آدرش و فروغ کا باعث بنی۔ یہ تاریخی شہر سمیری، عکادی، کلدانی اور آشوری سلاطین کا دارالسلطنت رہا۔ ہمسایہ بادشاہوں اور ملکوں سے سفیروں اور مذہبی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کے غول کے غول بابلی سلطنت کے پایۂ تخت چلے آتے اور شاہی دربار میں ان کا نہایت پُروقار و اثر انگیز قدیم آداب و رسومات کے تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا جاتا۔ سامیوں کا پُرافتخار دارالسلطنت حکمرانوں اور رعایا کی زندگیوں، عادات، شان و شوکت، خوبیوں اور خامیوں کا صحیح اور مکمل عکاس تھا۔ تمام قدیم سامی شہروں میں بابل، اپنی کشادہ و وسیع اور دلکش و دیدہ زیب عمارات کے ساتھ تمام متبرک اشیاء میں سے متبرک ترین تصور ہوتا تھا۔ یہ قابلِ فخر اور مایۂ ناز شہر بارہا، فاتحوں کے شیطانی غیظ و غضب کا نشانہ بنا اور ان کی وحشتناک عفریت نے اس کے انگ انگ کو نوچ ڈالا۔ اشوریہ کے شہنشاہ سرگون دوئم جسے سیری کیپو (SiRi KiPU) کے نام سے زیادہ صحیح طور پر لکھا گیا ہے اور جسے ۷۰۵ ق.م میں قتل کیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے سناچریب (SANNA CHERIB) کو اس کے جھوٹے وقار، غرور و تکبر اور سخت گیری کی بناء پر سلطنتِ بابل کے تمام قبائل نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی سیاسی اور مذہبی پالیسی و حکمتِ عملی نے اشوریہ اور بابل کے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ جب اس نے عروس البلاد بابل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر کئی ہفتوں تک اپنے قاہر و ظالم سپاہیوں کو اسے تاخت و تاراج اور لوٹ مار کرنے کا اذنِ عام دیا۔ بالآخر ۲۵ ربیت ۶۸۱ ق.م کو اسے اس کے بیٹے نے قتل کر ڈالا۔ نمرود نے اس شہر کی امارت زیب و زینت اور شان و شوکت کے عظیم ترین خزائن میں بڑا اضافہ کیا جس میں بلوص کا معبد بھی شامل تھا۔ یہ معبد اپنے فنِ تعمیر و ساخت اور ہیئت کے لحاظ سے پوری قدیم دنیا میں لاثانی تھا۔ تمام بابلی سلاطین کے ادوارِ حکومت میں بلوص کا معبد، مرجعِ خلائق و خواص تھا۔

وہ امارت، خزائن، خوشحالی، تمکنت، شان وشکوہ اور سطوت ودبدبہ کا مرکز تھا۔ ڈیوڈورس (DIODORUSS) کے مطابق، بلوص کے معبد سے صرف زرکسیز (XCIRXES) کے نکالے جانے والے سونے کی قیمت ۷،۳۵۰ ایٹیک (ATTIC) مساوی بہ ۲۱،۰۰۰،۰۰۰ اسٹرلنگ پونڈ تھی۔ اس کے علاوہ شاہی وقومی دولت وخزانہ کے کثیر صرفہ سے تعمیر کردہ عکادی، کلدانی اور اشوری ادوار کی عظیم الشان عمارات ومحلات اس زمانے کے عجائبات میں شمار ہوتی تھیں[۲]۔ اس پر طرہ یہ کہ بنوکدنصر نے بابل کی تزئین وتمکین میں مزید چار چاند لگادیئے۔ اس دار السلطنت کی از سرِ نو تعمیر کی گئی اور دنیا کا عظیم ترین پر جلال شہر بن گیا وسیع پیمانے پر قلعہ تعمیر ہوئے۔ اس نے دریائے فرات کے مشرقی جانب دریائے دجلہ کے کنارے واقع شہر اوپس (OPIS) تک ایک دفاعی دیوار تعمیر کرکے اس کے اردگرد ایک گہری خندق کھودی۔ تعمیری فنون میں شیشے سے مرصع کاری، قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے وسیع پیمانے پر استعمال کا رواج عام ہوگیا تھا۔ بڑی بڑی اینٹوں سے زیر زمین نالے بناکر گندگی کی نکاسی کا نظام مروج تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک بہت بڑا شاندار محل تعمیر کیا۔ اس کے اردگرد دیواریں بنوائیں اور محل پر قدم بہ قدم روشوں کی قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ہر ایک درختوں، پھلوں، اور پھولوں سے لدی ہوئی سرسبز وشاداب، جاذب نظر تھیں۔ چھتوں سے معلق باغات اس قدر دیدہ زیب اور پرکشش تھے کہ ان کو یونانیوں نے قدیم دنیا کے

---

۱. ویسے اٹیک ایتھنز کو کہا جاتا ہے مگر اس کے معنی قیمت ووزن کے پیمانے کے ہیں۔ مترجم

۲. ملاحظہ ہو: (1) E. Meissner, Babylonia and Assyrian (1920-24, bill).
(2) History of Babylon by L. W. King.
(3) Early History of Assyria (1928, bill) by Sydney Smith.

سات عجائبات میں سے ایک عجوبۂ روزگار قرار دیا تھا۔[۱]

بمپور:

سرباز اور کرمان کے سرحدی ضلع بم نرماشیر کے درمیان بمپور کا وسیع و عریض خطہ واقع ہے جس کے مرکزی شہر کا نام بھی یہی ہے۔ بمپور ایرانی بلوچستان کا ہمیشہ سے اہم شہر رہا ہے اور باور کیا جاتا ہے کہ یہ گدروشیا[۲] (مکران) کا پورا[۳] (ΠΟΥΡΑ) تھا۔ جہاں سے سکندر اعظم ۳۲۴ ق.م میں ہندوستان سے واپسی پر گزرا تھا۔[۴] القدیمی کی مشہور زمانہ کتاب میں اس جگہ کا نام بربر لکھا گیا ہے۔ اس جگہ کی نمایاں خصوصیت اس کی مٹی سے تعمیر کردہ وسیع و عریض قلعہ ہے جو سو (۱۰۰) فٹ بلند ہے اور دریائے بمپور کے شمال میں تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس دریا کے آگے بند ھ باندھ کر نہروں کے ذریعہ قریبی اراضیات پر سیلابی پانی لے جایا جاتا ہے جن میں غلہ کاشت کیا جاتا ہے۔ قدیم بلوچی شاعری میں اس شہر کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ بلوچوں کی روایاتی تاریخ

۱۔ قدیم و جدید تمدن، از: ٹی۔ والٹر والبینک اور الاسٹیئر ایم ٹیلر۔ صفحہ ۸۵

"Civilization Past and Present" by T. Walter Walband and Alustair M. Tayler. P. 85)

۲۔ مکران کو یونانیوں نے گدروشیا کا نام اغلباً اس زمانے کے کئی قبائل میں سے ایک گیدرس (GADRAS) کی وجہ سے دیا تھا جو آج تک یہ قبیلہ اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

(نوٹ:۔ لس بیلہ یہ قبیلہ گدور کے نام سے مشہور ہے۔ مترجم)

۳۔ یونانی رسم الخط کے حروف۔ مترجم

۴۔ مشرقی خلافت کے علاقے، از: جی۔ لے۔ اسٹرینج۔ ص ۳۲۹

۵۔ فارس اور مسئلۂ فارس، از: جارج این کرزن۔ جلد دوئم ص ۲۶۳

کا تمام غیر متنازعہ اور مصدقہ ورثہ بمپور کی معاشرتی زندگی کے ازمنۂ وسطیٰ کا رہینِ منت ہے گذشتہ دس صدیوں میں بمپور، بابل کا نعم البدل رہا ہے جسے بلوچوں نے قرنہا قرن سے فراموش کر دیا تھا۔ اس ضمن میں بلوچی شعراء کے خیالات کی ہم آہنگی کی بناء پر ہمیں بلا تردد اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بمپور، اپنی شہرت کا جائز طور پر مستحق تھا۔ وہ کبھی سب سے بڑی مصروف اور پر ہجوم منڈی ہوا کرتا تھا جہاں سارے بلوچی علاقوں کی تجارت اور لین دین ہوتی تھی۔ یہ شہر بلوچوں کو آگے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے، افرادی قوت فراہم کرنے کا بنیادی مرکز تھا۔ صدیوں کی افراتفری اور اضطراب کے بعد قومی روح کے بیدار ہونے پر انیسویں صدی عیسوی میں بمپور ایک بار پھر حریت پرست آزاد بلوچوں کے سرداروں کا رسمی مرکز بن گیا۔ اس پوری قوم کا قبائل میں، ان قبائل کا شاخوں میں اور ذیلی شاخوں میں تقسیم و تفریق، اس معاشرہ کی پیداوار ہے۔ جب بمپور کی سرزمین سماجی و سیاسی پردہ پر ابھرا۔ بلوچوں کی بمپور سے مکران کی جانب انخلاء کی داستان، انخطاط کی طویل تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہری شکست و ریخت کے باوجود اس شہر کو ایرانی بلوچستان میں سب سے بڑے تجارتی مرکز کا امتیاز حاصل ہے۔ البتہ اب صرف جدید آباد کردہ قصبہ زاہدان کو اس پر برتری و سبقت حاصل ہے۔ زراعت کے میدان میں جدید بمپور اور اس کے دیہی علاقوں کو ایران بلوچستان کے یوکرائن کا درجہ حاصل ہے۔ نخلستانوں کے سرسبز و شاداب سلسلوں سے دیدہ و نگاہ کو فرحت اور قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے جس پر لوگوں کے تسلی بخش روزگار و معاش کا انحصار ہے۔

کیچ:

مکران بلوچستان کا دروازہ ہے اور کیچ اس کی کلید ہے۔ مکران کی تاریخ کیچ کی تاریخ ہے۔ قدیم عرب مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے کیچ باکیز کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ خاص کیچ درحقیقت اس تنگ خطے پر مشتمل ہے جو دریائے کیچ (کیچ کور) کے

دونوں جانب سامی سے لے کر ناصر آباد تک پھیلا ہوا ہے جس میں مذکورہ دونوں جگہیں بھی شامل ہیں۔ مزید برآں پیدارک اور بالگتر کے علاقے بھی اس میں شامل کئے جاسکتے ہیں مجموعی طور پر وادی کیچ میں پانی کی کمیابی کا شکوہ نہیں کیا جاتا۔ کاشتکاری کا سارا نظام آبپاشی پر منحصر ہے اور ذرائع آبپاشی کاریزات اور کورجو (آبی چشمے جو دریا سے نکالے جاتے ہیں) دوسرے ذرائع پیداوار کے علاوہ، اس وادی میں لگائے گئے نخلستان زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ کیچ کی اصطلاح وسیع ترمعنوں میں نہ صرف تربت کے اردگرد کے علاقوں مند، تمپ اور خاص کیچ پر مشتمل عظیم وادئ مکران اور کولواہ کے طاس کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ بلکہ اس وادی کے شمال اور جنوب میں واقع علاقوں بشمول بلیدہ، دشت اور کلاپنج کے لئے بھی مستعمل ہے۔ یہی تاریخ میں مذکور کیچ مکران ہے جو مارکوپولو[1] کا کیز مکران ہے اور ابن بطوطہ[2] کا کیچ مکران ہے۔ اسے اس نام سے اس لئے پکارا گیا تھا تاکہ ایرانی مکران (ایرانی بلوچستان) سے اس کی تمیز وتفریق ہو۔ قدیم عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دو خطوں پر مشتمل پورے علاقے کو مکرانات کا نام دیا تھا جو پچانوے ہزار مربع میل پر محیط ہے۔

کچھ قدیم سلاطین نے کھنڈرات، ٹیلوں، ملبوں اور زیرزمین آبی نہروں یعنی کاریزوں کی شکل میں اپنے خاموش دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔ وادئ کیچ میں تربت کے مغربی جانب دو میل کے فاصلے پر ایک قدیم کھنڈر موسومہ بہمن واقع ہے۔ جس کی تسمیہ، فردوسی کی رزمیہ شاعری کے ایک ہیرو اور کردار اسفندیار کے بیٹے بہمن کی وجہ سے ہے۔ کیچ میں

۱۔ مارکوپولو کی سیاحتیں، از: سر ایچ یول۔
(Travels of Marcopolo by Sir H. yule)

۲۔ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جلد دوئم۔ مطبوعہ مصر

شہنشاہان کاؤس اور کیخسرو کے ناموں کی مناسبت سے قدیم کاریزات کاؤسی اور خسروی موجود ہیں. خسروی کاریز کو خنری کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے. ایک اور کاریز کلاتُک میں سعدوباد کے نام سے مشہور ہے جس کا صحیح نام سعد آباد ہے اور جسے مقامی روایات کے بموجب خلیفۂ دوئم حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں عراق کے فاتح اور والی سعد بن ابی وقاص نے احداث کیا تھا. سومرہ شہزادی سستی کا مشہور زمانہ عاشق اور بلوچوں کے ہوت قبیلے کے سرداریوں کی یادگار، مٹی سے تعمیر شدہ خستہ حالت میں قلعہ دریائے کیچ کے کنارے زمانے کے نشیب و فراز کے مقابلے کے لئے ابھی تک ایستادہ ہے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیچ کے لوگوں کو قدرت نے تجارتی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے. اور اس کے تجارت پیشہ لوگ مشرق وسطیٰ میں تجارتی مال کی درآمد و برآمد کا کاروبار کرتے تھے. مکران میں بحری راستوں سے وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی. لنکا، خلیج فارس کے شیوخ کی ریاستوں اور افریقی سواحل سے اس کی منڈیوں میں قیمتی ساز و سامان اور تجارتی مال کا کاروبار عام تھا. تیرھویں صدی کے اختتام پر مارکوپولو کینیز مکران کے لوگوں کے بارے میں رقم طراز ہوتا ہے کہ "ان کا ذریعۂ معاش تجارت اور صنعت و حرفت تھا. وہ پیشہ ور تاجر تھے. اور بری و بحری راستوں سے تمام جوانب بڑے پیمانے پر آمد و رفت کرتے تھے." اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہمارے سب سے بڑے وقائع نگار، علی شیر قانی لکھتا ہے کہ "مکران سے کسی زمانے میں کچھ گجرات تک کاروان جاتے تھے."[1] کیچ کی وسعت اور اہمیت میں پندرھویں صدی عیسوی میں نیاض اور جیالے اور بلوچوں کی مطلق العنان سیادت کے زمانے میں مزید اضافہ

---

۱. ملاحظہ ہو: تحفۃ الکرام از علی شیر قانی. تالیف ۱۷۶۶ء

ہوتا گیا۔ اس زمانے کی منظوم داستانوں میں اس ملک میں کچھ کو سب شہروں پر افضلیت اور فوقیت حاصل تھی۔ ازمنۂ قدما میں وادیٔ کچھ اور اس کے مضافاتی علاقوں کو اپنے کماد اور شکر کی بنا پر بڑی شہرت حاصل تھی[۱]۔ کاشتکاری کے اوزار وآلات آج بھی نہایت قدیم زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکڑی کے ایک سادہ اور کند ہل سے جسے بیلوں کے ذریعہ جوتا جاتا ہے، صرف زمین کی سطح پر لکیریں پڑ سکتی ہیں جن پر تخم ڈالنے سے خاطر خواہ فصل اگائی نہیں جا سکتی۔ کچھ میں سوزن کاری اور کشیدہ کاری کے شہکار، بلوچی فن وثقافت کے ہمیشہ سے اور آج بھی جزوِ لاینفک ہیں۔ ان کو تقریباً اس قدر عمومی مقبولیت حاصل ہے کہ مغربی ممالک میں بھی ان کی تخلیق، اصلیت اور عمدگی کو دادِ وتحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

گنداوہ :

کوہستان قلات کے اس پار کچھی کے میدانی علاقے میں گنداوہ کو ازمنۂ وسطیٰ اور دورِ جدید میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ طوفانی تاریخ کے ایک دور سے گزرا ہے۔ اس کے قریبی مغربی سطح مرتفع میں جو سیاسی تبدیلی جونہی وقوع پذیر ہوئی ہے، اس کے اثرات دوسرے روز ہی گنداوہ پر پڑے ہیں۔ اس کے میدانی علاقے کہستانی مداخلت کاروں کے لئے ہمیشہ سے پرکشش رہے ہیں۔ گنداوہ کو کئی بار سرِ تسلیم خم نہ کرنے کی بناء پر تباہی وبربادی کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ اس کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں ہمیں عرب وقائع نگاروں اور مورخوں کی نگارشات میں اسکے تذکرے اور حوالے ملتے ہیں۔ عربوں کے ماتحت گو کہ یہ ایک محدود مطلق العنان امارت تھی مگر پھر بھی یہ ایک بڑا مرکزی شہر تھا۔ عباسی خلیفۃ المنصور نے ہشام التغلبی کو سندھ کا

---

۰۱ معجم البلدان از: یعقوب بن عبداللہ الہروی

والی مقرر کیا تو انہی عمر بن جمال کو ہند کے علاقوں کی تسخیر کے لئے ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے کشمیر اور ملتان کو فتح کیا، اور آگے بڑھ کر قندابیل (گنداوہ) کے عرب باشندوں کی باہمی شورش کو بھی ٹھنڈا کیا۔[۱] خلیفہ معتصم باللہ نے عمران ابن موسیٰ ابن یحییٰ ابن خالد البرمکی کو ۲۲۱ ھجری میں سندھ کا گورنر مقرر کیا تو اس نے قیقانیوں کے خلاف جوزط (جت) تھے، لشکر کشی کر کے ان کو شکستِ فاش دی اور البیضہ کے نام سے ایک شہر آباد کر کے اس میں قلعے تعمیر کر کے ان میں فوجیں جمع کر دیں اور اسے ایک فوجی مرکز اور چھاؤنی کی حیثیت دے دی۔ اس کے بعد اس نے المنصورہ کی جانب پیش قدمی کی اور پھر قندابیل کی طرف بڑھتا چلا گیا، جو کہ ایک پہاڑی پر واقع تھا اور اس کا حکمران محمد ابن الخلیل تھا۔ عمران نے قندابیل کے شہر پر قبضہ کر کے اس کے حکمران کو اسیر بنا کر قصدار (خضدار) لے گیا۔[۲] ابن حوقل نے مکران کی شمال مشرقی سرحدات پر اور ہندوستان کی سرحد کے قریب واقع دو ولایتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک توران تھی جس کا صدر مقام قصدار تھا اور دوسری اس کے شمال میں بدھا تھی جس کا مرکز قندابیل تھا۔ اس نے قندابیل کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ ایک وسیع و عریض شہر ہے اور وسیع علاقے میں تنہا ایستادہ ہے، جہاں کوئی نخلستان نہیں ہے۔[۳] اس کے ماتحت علاقوں میں قیرقانان یا قیقانان کا شہر بھی شامل تھا۔[۴] اس شہر کی شناخت کو اس کے حالات کی بنا پر

۱: فتوح البلدان از: البلاذری، صفحہ ۲۳۲

۲: ٭ ٭ صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۴، ۳: ملاحظہ ہو: المسالک والممالک از ابن حوقل ۴: گلڈمیسٹر (GELDEMEISTIR) کے مطابق ابن حوقل نے قیرقانان کو توران کا ایک شہر ظاہر کیا ہے۔

موجودہ شہر قلات پر منطبق کیا جاتا ہے۔ الاصطخری کے مطابق "قندابیل ایک بہت بڑا شہر ہے صحرا میں واقع ہے اور بدھا کی حدود میں شامل ہے[1]۔ الادریسی رقمطراز ہے: "بدھا کی حدود سے لے کر شہر کرد (کیز) تک دس دن کی مسافت ہے۔ بدھاء مکران کے آخری کونے پر واقع شہر تیز تک سولہ دن کی مسافت ہے۔ بدھا کے باشندے جس شہر سے سب سے زیادہ آمدورفت کرتے ہیں، وہ قندائیل ہے[2]۔ سندھ میں عربوں کی فوجی چھاؤنیوں کے بارے میں ایلیٹ تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان میں سے ایک بیضہ تھا، دوسرا قصدر تھا اور تیسرا قندابیل (قندائیل) تھا[3]۔

میر معصوم کے الفاظ میں سولہویں صدی عیسوی میں گنداوہ کی حالت یوں تھی "گنجابہ کے قریب جو سیوی کا ماتحت علاقہ ہے، پانی کا ابلتا ہوا چشمہ بہتا ہے، اور اس کی کافی بڑی زمین زیر آب ہے۔ اس پانی میں مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ گنجابہ کے پہاڑوں میں کسی پہاڑی کے کنارے پر ایک بارہ دری سی باہر ابھری ہوئی ہے جس کے ساتھ ایک آہنی پنجرہ لٹکا ہوا ہے۔ جس میں کوئی خزانہ چھپایا گیا ہے۔ مگر کسی کا بھی ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر اوپر سے اس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو کسی کو پہاڑی کی چوٹی بھیج کر رسی پھینکنی پڑتی ہے مگر پھر بھی وہ بہت دور فاصلے پر نظر آئے گی۔ اور پہاڑی کی اپنی اونچی

---

۰۱ ابتدائی عرب جغرافیہ نویس صفحہ ۳۷

(ELLIOT, VOL-1 EARAB GEOGRAPHI GUPTA)

۰۲ ایضاً صفحہ ۱۱۶

۰۳ "ہندوستانی مورخین"

از: ایلیٹ جلد اول صفحہ ۴۶۵

سطح ہموار ہے جبکہ زمین سے وہ جگہ کافی بلندی پر واقع ہے[1]۔" ایلیٹ کی کتاب مورخین میں مذکورہ بالا متن کو یوں بیان کیا گیا ہے: "گنجاوہ کی پہاڑیوں میں سے ایک بلند و بالا پہاڑی ہے جس کے ساتھ ایک آہنی پنجرہ آویزاں ہے۔ جس میں روایت کے مطابق کوئی قیمتی چیز ہے۔ مگر اس تک رسائی ممکن نہیں۔ اگر کوئی بالائی جانب سے اس کی طرف ایک رسی کے ذریعے اترے تو وہ دور ہو جاتا ہے۔ اگر نیچے سے اس کی طرف چڑھائی کی جاتی ہے تو اس کی بلندی آسمان تک بڑھتی جاتی ہے۔ اور زمین نیچے چلی جاتی ہے[2]۔"

سندھ اور مکران پر عربوں کے تسلط کے زمانے میں گنجابہ سندھ اور وسطی سطح مرتفع قلات جسے عرب وقائع نگاروں نے توران کے نام سے یاد کیا ہے، کے درمیان گنجابہ، فوجی رابطے کا وسیلہ تھا۔ سندھ اور باقی ماندہ بلوچستان کے درمیان تجارت کا راستہ یہی تھا۔ اور پیداواری لحاظ سے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں اس کی اراضیات قابل رشک تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام پر بلوچوں کا سیلاب گنداوہ اُمنڈ آیا۔ اور کچھی کا سارا میدانی علاقہ جیالے اور جانباز بلوچوں کے جمِ غفیر کی آماجگاہ بن گیا جن کی قیام گاہیں سفید اور سیاہ خیموں پر مشتمل تھیں اور جسم کے زیادہ تر حصے تیر، کمان لمبی خم دار تلواروں اور نسبتاً چھوٹی گول ڈھالوں سے سجے ہوتے تھے۔ اور تیز رو تازی گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور تاخت و تاراج کے شوق کو پورا کرنے کے لئے کوہستانِ قلات کی پہاڑی چراگاہوں سے لے کر سبی اور ڈھاڈر کے سرسبز و شاداب میدانوں اور چراگاہوں تک پھیلے ہوئے علاقوں کو پاؤں تلے روند ڈالتے تھے۔ یہ پھلتا پھولتا شہر رند اور لاشار بلوچ قبائل کے کئی یادگار تنازعوں اور کشمکشوں کا مستقل نظارہ پیش کرتا رہا۔ اور بلوچی

۱۔ ملاحظہ ہو: تاریخ سندھ از میر معصوم

۲۔ جلد اول صفحہ ۲۳۸

امارت وسیادت کے دور میں شہ مُرید اور اپنے عصر کی یکتائے روزگار نازنین اور مندو کی پری وش دختر، حانو کا شہرت یافتہ رومان اس کے لئے قابلِ صد افتخار امتنان تھی۔ بلوچوں کی حکمرانی کے وقت گنداوہ کا علاقہ چاندی اور سونے کے زیورات بنانے (زرگری) کے فن میں بہت مشہور تھا، قدیم بلوچی منظوم داستانوں کے ذریعے ہم تک پہنچنے والی تابناک معلومات اور تفصیلات کے مطابق ہر آدمی کو پندرھویں صدی عیسوی کے بارے میں نہایت ہی دلنواز سنہری تصور قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے مگر جو آج اپنے پُر افتخار ماضی کی شان و شوکت اور اہمیت کی کسی طرح بھی غماز نہیں۔ مولہ کے عظیم چشمے کا سالہا سال رواں پانی خاص گنداوہ کے ہموار زرخیز میدان میں پھیل کر اس کی شادابی کا باعث ہے۔ مگر باقی ماندہ قرب وجوار کی تمام اراضیات کہستانی سلسلے سے شروع ہو کر سندھ کے میدانی علاقے تک پھیلی ہوئی ہیں جو ناقابلِ اعتبار حد تک قدرتی طور پر زرخیز ہیں مگر ان قوتِ نمو سے بھرپور ذخائر کی اس دولتِ گراں مایہ کو ایک ایسی سرزمین پر، جو اپنی غربت پر ہمیشہ سے نوحہ کناں ہے، بیکار پا کر انتہائی افسوسناک منظر ابھرتا ہے۔

سیوی (سبی):

سیوی کو کن لوگوں نے آباد کیا۔ اور وہ کونسے ذرائع تھے جو ان کی تباہی اور زوال کا باعث بنے۔؟ ہمارے سامنے ایسا کوئی تاریخی مواد موجود نہیں کہ ان سوالات کا قابلِ اعتبار جواب مہیا کر سکیں۔ اس لئے اب تک تاریخ کے اس فراموش کردہ صفحے کو پُر کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں، دنیا کے ہر حصے میں افسون و اساطیر اور داستانیں، ہر جگہ کی وجہ تسمیہ کے تعین میں مدد ثابت ہوتی ہیں، ہمیں اس عنصر کی حقیقی تاریخ کے بحث و مناظرہ میں الجھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ابھی تک مزید تحقیق و تدقیق کی محتاج ہے۔ تاہم یہ ایک قدیمی شہر ہے اور مقامی روایات کے مطابق، اس کے نام کا ماخذ سیوی ہے جو سیو النسل اور حکمران

خاندان کی ہندو شہزادی تھی۔ اس خاندان نے مکران اور سندھ کے عربوں کے ہاتھوں فتح ہونے سے قبل اس حصّے پر حکمرانی کی تھی۔[1] ایک دوسری مقامی روایت یوں ہے کہ ایک ہندو حاکم جس کا نام سیوا یا سیوا تھا، اس نے قلات اور کچھی کے میدانی علاقوں پر حکمرانی کی تھی اور اسی نے یہ شہر بسایا تھا۔ حالیہ برسوں میں قلات میں میری کے قلعہ سے کچھ قدیم آثار کی کھدائی ہوئی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے اس خطے میں کوئی ہندو خاندان حکمران رہا ہے۔ اسلام سے قبل اور طلوعِ اسلام کے وقت، سندھی تواریخ کے مطابق، دریائے سندھ پر ایک مضبوط و محکم ہندو بادشاہت قائم تھی۔ جس کی شمالاً کافی دُور، کشورِ کشمیر کی سرحدات تک، شمالاً شرقاً ریاست قنوج کی سرحدات تک، غرباً مکران اور قردان اور قیرقانان یا قیقانان تک اور شرقاً جنوباً صورت پھیلی ہوئی تھیں اور اس کی جنوبی سرحد بحستان یا سیستان کی سرحدات تک تھیں، یہ پورا جنوبی خطہ بلیوص کہلاتا تھا۔ اور بعد ازاں قندہار کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن لے ورٹی (RAVERTY) طاقتور اور مضبوط مسلمان بادشاہتوں سے گرے ہوئے کسی ایسی طاقتور ہندو شہنشاہیت اور سلطنت کی موجودگی کے بارے میں سخت دلائل دیتا ہے۔[2] اس کا خیال یہ ہے۔ کہ عربوں کی فتح کے بعد" کوئی ایسی تاریخ یا شہادت کا کوئی ایسا معمولی نشان موجود نہیں جس کی رُو سے یہ ظاہر ہو سکے کہ کسی بھی ہندو مملکت کا اس علاقے کے کسی حصّے میں کوئی وجود تھا۔" سیوی کے نواح اور کچھی اور درّۂ بولان میں موجود قدیم ٹیلوں کے بارے میں مقامی روایت یہی ہے کہ ان کا تعلق ایک ہندو حکمران دلورا سے ہے۔ اس حکمران کے

۱۔ سندھ پر عربوں نے ۹۳ھ ہجری میں حملہ کیا تھا۔ ملاحظہ ہو یعقوبی جلد دوئم صفحہ ۲۴۶

۲۔ NOTES ON AFGHANISTAN AND PART OF BALUCHISTAN BY RAVERTY - PP-571-75

بارے میں کچھ حوالے بھی ملتے ہیں۔ ایک سندھی مورخ بیان کرتا ہے کہ دلورائے سندھ کا حاکم تھا۔ اور اس کا اپنے چھوٹے بھائی چھٹا آمرانی سے جھگڑا ہوا جو بھاگ کر بغداد چلا گیا اور اسلام قبول کیا۔ خلیفۃ الوقت نے کچھ سیدوں کے علاوہ فوج کا ایک چھوٹا دستہ دے کر اس کی امداد کی۔ وہ واپس سندھ چلا آیا۔ دلورائے نے اپنی ایک بیٹی ان سیدوں میں سے ایک کے عقد میں دے دی[1]۔ روایات کے مطابق مذکورہ حکمران خون خواری اور غارت گری میں شہرت رکھتا تھا اور شرفاء کی لاشوں پر اپنی عیاشیوں اور بدمعاشیوں کے محل تعمیر کرتا تھا۔ اچھائی اور نیکی اس کے لئے زہر ہلاہل بن چکی تھی اور وہ ہمیشہ لوگوں کی عزت و غیرت کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا ہوتا تھا۔ روایت یہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ بھی ہمبستری کرتا تھا اور اسے اپنی گناہ آلود بطن سے اس مرغوب گناہ کبیرہ کے طفیل کئی اولادیں ہوئیں جو خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب کے نزول کا باعث بنیں اور انہوں نے اس شہر کو تہہ و بالا کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ تاریخ طاہری کے مؤلف کا بیان ہے کہ چھٹا آمرانی واپس سندھ آ گیا۔ سیوستان میں فوت ہوا اور اس کا مقبرہ وہیں ہے[2]۔ کئی مورخین نے غلطی سے سیوی کے نام کو سیوستان کے نام سے تطبیق کی ہے۔ اور دونوں کو خلط ملط کیا ہے۔ مگر یہ ایک فاش غلطی ہے سیوی کا چھوٹا محال کبھی بھی سندھ میں ٹھٹہ کے وسیع و عریض سیوستان سرکار کا جزو نہیں رہا ہے۔ یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی ہے کیونکہ سیوی کے حالات و کوائف، مکران قندھار اور ملتان کے ماتحت علاقوں، بلوچوں، راجپوتوں، جتوں اور سندھ کے دیگر قبائل کی نقل و حرکات کی قدیم تاریخی داستانوں اور جغرافیائی تذکروں کے ساتھ

۱۔ "تحفۃ الکرام" ایلیٹ جلد اول۔ صـ ۲۵۸

۲۔ "تاریخ طاہری" ایلیٹ صـ ۲۵۸

شامل اور خلط ملط رہے ہیں۔ سلطان ناصر الدین قباچہ کے دورِ حکومت میں عربی تاریخ "فتح نامہ" کا جسے ہم ترجمہ کی وجہ سے "چچ نامہ" کے نام سے جانتے ہیں، فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور اس کا انتساب سلطان کے وزیر صدر جہاں وعین الملک حسین ابن ابی بکر الاشعری کے نام کیا گیا۔ اسی تاریخ میں سیوی اور اس کے شاملات وعلاقہ جات کا تذکرہ موجود ہے۔ جو سیوستان سے قطعاً مختلف تبلائے گئے ہیں۔ اس زمانے میں پُنن چھُفن کا بیٹا وکیہ سیوی کے علاقے کا حکمران تھا جو کہ ملتان صوبہ کی بھکر سرکار کا ایک حصہ تھا۔ آئینِ اکبری کے مؤلف قندہار سرکار کی حدود کا تذکرہ کرتے وقت لکھتا ہے: "یہ عرض میں سندھ سے فرح تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے جنوب میں سیوی واقع ہے۔ مغرب میں فرح ہے۔ کابل اور غزنین مشرق اور شمال کے درمیان ہیں"۔ اس سے کوئی اور وضاحت نہیں ہوسکتی کہ سیوی کا ضلع سیوستان سے تطابق نہیں رکھتا ہے۔ یہی مؤلف کسی دوسری جگہ یوں اظہار کرتا ہے: "بکھر اور سیوی کے درمیان ایک دشت ہے جس میں متواتر تین مہینوں میں بادِ سموم چلتی ہے"۔ اس دشت کو اس علاقے کے لوگ "بطے" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور کسی زمانے میں یہ "دشتِ بیداری" کے نام سے مشہور تھا۔ بیداری ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی بے خوابی اور آگاہی کے ہیں۔ کیونکہ صحرا کے اس حصے میں سفر کے دوران مسافروں کو اکثر اوقات شمالی جانب کی پہاڑیوں پر لوٹ مار کرنے والے بلوچ جھتوں کے ہاتھوں زک اُٹھانی پڑتی تھی۔

ہم تاریخ اصطخری میں پہلی مرتبہ سیوی اور اس کے شاملات کا تذکرہ پاتے ہیں۔ سیوی کے اردگرد کے علاقے کو عرب جغرافیہ دان بالص، بصورت بالش یا والشتان کے ناموں سے جانتے ہیں۔ اصطخری کے مطابق مرکزی شہر سیوی یا سیوراہ تھا لیکن والی عام طور پر القصر (قلعہ) میں قیام کرتا تھا۔ جو کہ اصفانجے یا اصفانجوئی[1] سے

۱۔ اصفانجے یا اصفانجوی، زیارت کے مشرق میں واقع موجودہ قصبہ سنجاوی ہے۔

ایک "لیگ" کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس سے صحیح جائے وقوع متعین نہیں کیا جا سکتا مگر وہ سیوی سے طخارج کے سجاورے کے راستے سفر کرتے وقت دو جگہوں پر اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔[1]

بولان اور ہرنائی کے دروں کے دہانوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے سیوی کی اہم حیثیت کے پیش نظر کئی مرتبہ اسے محاصروں کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کی تاریخ کے ابتدائی دور میں سیوی کی تقدیر خراسان اور قندہار کے بجائے سندھ اور ملتان کی تقدیروں سے وابستہ رہی۔ صوبہ ملتان کے دیگر حصوں کی طرح جس کا خطۂ سبی بھی ایک حصہ در کن رہا، یہ قصبہ بھی سلطان ناصر الدین قباچہ کی حاکمیت کے تحت تھا۔ ہندوستان پر امیر تیمور گرگان سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) میں ہندوستان پر حملہ سے قبل وہاں پھیل ہوئی افراتفری اور سرکشی اور عدم اعتماد کی فضا میں خانزادۂ سمہ کے جام فتح خان نے ملتان کی بکھر سرکار پر اپنا تسلط جما لیا جس کے ساتھ سیوی ایک ضلع کے طور پر شامل تھا۔ اس کے بعد جام نظام الدین عرف جام نندہ سنہ ۸۶۶ھ (بمطابق ۶۲-۱۴۶۱ عیسوی) میں سندھ پر حکمرانی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ سنہ ۵۶-۱۴۸۵ء میں امیر جلا کرنے جام نندے سیوی چھین کر اس پر اپنا پرچم لہرایا۔ سردار نے پچیس سال تک مستقل طور پر اپنا تسلط برقرار رکھا۔ بعد ازاں سیوی کے قصبہ پر ارغون سردار شاہ بیگ سنہ ۱۵۱۱ء میں قابض ہوا۔ سنہ ۱۵۲۲ء میں اس کے انتقال پر اس کے بیٹے مرزا شاہ حسین نے یہاں کی عنان حکومت سلطان محمود بن میر فضل کوکلتاش کے حوالے کر دی۔[2] میر معصوم لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے کئی قلعوں کو فتح کیا جو عرصۂ دراز سے بلوچوں کے پاس تھے۔ اس نے

۱۔ مشرقی خلافت کے علاقے ص ۳۳۳ بحوالہ اصطخری۔

۲۔ کوکلتاش کا لفظ مغلوں کا ایک لقب ہے۔

کوہستان کے ان کمینوں کو سختی سے دبا کر ان کو زیر نگین کر لیا۔[1]

۱۵۹۴ء میں شاہ حسین کے دار فانی سے کوچ کرنے پر اس کی مملکت مرزا عیسیٰ ترخان اور سلطان محمود کے درمیان تقسیم ہوئی۔ ۱۵۹۳ء میں مؤخر الذکر نے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی اطاعت قبول کر لی جنہوں نے سیوی پر اس کی جاگیرداری پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ارغون خاندان کے زوال پر اپنی پٹھانوں نے جو عرصہ دراز سے حالات کے رخ پر نظر جمائے ہوئے تھے، سیوی پر قبضہ کیا۔ میر معصوم بکھری کو سالہا سال بعد سیوی کی کمان سپرد کی گئی اور اس نے ۱۰۰۲ ہجری (بہ مطابق دسمبر ۱۵۹۳ء) میں پٹھانوں سے سیوی چھین لیا۔ میر معصوم نے اپنی تاریخ میں اس دور کے سیوی اور نواحی علاقوں کی درخشاں یادگاروں اور اہم خصوصیات کا بالتفصیل ذکر کیا۔ وہ تحریر کرتا ہے: "اس خطے کا ایک عجوبہ روزگار گنبد، سیوی کے شمال میں واقع ہے۔ جو سندھی زبان میں 'مترو گھر' کے نام سے مشہور و معروف ہے لیکن جب بھی وہاں کوئی چلا جاتا ہے تو یہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ روایتاً مشہور ہے کہ سلطان محمود نے ایک مرتبہ دو تین ہزار افراد کو جمع کیا جو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے لگے جہاں پر یہ نظر آتا تھا۔ مگر ان کو وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا اور نہ ہی گنبد دکھائی دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی طلسمانہ اختراع ہے جسے قدماء نے وہاں کھڑا کیا ہے اور اس میں خزائن کے انبار پوشیدہ رکھے ہیں۔ ایک دفعہ کسی درویش نے وہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا جس کے بعد کئی افراد نے وہاں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی جستجو کی مگر تمنائے مراد کسی کی بر نہ آئی"

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں سیوی ملتان صوبہ کے بارہ محالوں میں سے

---

[1] ملاحظہ ہو: تاریخ معصومی۔

ایک تھا. ابوالفضل لکھتے ہیں — کہ گنجابہ (گنداوہ) سیوی کا ایک حصہ ہے. سیوی سے مغل خزانۂ عامرہ میں سالانہ تیرہ لاکھ اکیاسی ہزار نو سو تیس درم نقدی کی صورت میں ادا ہوتا رہا، مگر جنس کی صورت میں کچھ بھی نہیں ملتا تھا جیسا کہ قندھار کے محال کا رواج تھا. اورنگ زیب کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد، سلطنت کا مرکزی استحکام روز بروز زوال پذیر رہا. طوائف الملوکی، مرکز سے علیحدگی، تخریب کاری، شکست و ریخت اور وفاداریاں تبدیل کرنے کے رجحانات روزمرہ کا معمول بن گئے. خانہ جنگی، مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت نادر شاہ اور احمد شاہ کے تباہ کن حملوں اور برطانوی سلطنت کے طلوع پر مبنی تمام عوامل نے، آہنی انسان شہنشاہ بابر، جنہوں نے ایک ایسی مستقل حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی جو دو صدیوں سے زائد عرصے تک برقرار رہی، کے خاندان کے یکے بعد دیگرے متواتر کٹھ پتلی جانشین حکمرانوں کی تیزی سے زوال پذیری میں نمایاں کردار ادا کیا. اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک قندھار کے دُرانی آقا سیوی سے فیض یاب رہے. باقی ماندہ: بلوچستان کے ساتھ، انیسویں صدی کے وسط سے لے کر برصغیر ہند میں برطانوی سلطنت کے زوال تک، مزید ایک صدی تک، سیوی کا یہ تاریخی قصبہ برطانوی آقاؤں کی سامراجی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنتا رہا، جنہوں نے اولمپیا کے دیوتاؤں کی طرح اس خطۂ ارض پر حکمرانی کی حتیٰ کہ اس کے ہزاروں سال پرانے نام سیوی کو سبی میں تبدیل کر دیا.

سیوی اپنے جغرافیائی حیثیت، زمین کی زرخیزیت اور پیداواری قوت کی بنا پر اس ملک کی تاریخ کے قرونِ وسطیٰ اور ادوارِ جدید میں نمایاں اہمیت اور درخشاں حیثیت کی حامل رہا ہے. ایک ایسے ملک میں جو اپنے قابلِ یادگار مدفون خزائن پر نازاں ہے

---

۱. ملاحظہ ہو: آئینِ اکبری

سیوی کو اوجِ کمال میں پایا جاتا ہے۔ ٹیلوں، کھنڈرات اور منہدم شدہ نشانات و خرابات، جو کبھی عظیم الشان محلات و عمارات کے مکینوں کے غماز ہیں، سیوی اپنے سینے میں شکستہ و پارینہ کے ٹیلوں کی صورت میں نقوش کو اب بھی نمایاں کئے ہوئے ہے۔ اسے کئی بار تباہ کن سانحات کا سامنا کرنا پڑا اور ہر مرتبہ نئے نئے لوگوں کو اپنی گود میں پروان چڑھایا۔ قصبہ کے نواح میں بستیوں اور قلعوں کے سنہری آثار اب مکمل تباہی و بربادی کی شکل میں عبرت کدہ دہر بنے ہیں، زمانے کی دستبرد سے محفوظ قدیم آبادیوں کے باقی ماندہ آثار ایک شاندار اور عظیم الشان خطے کی صحیح غمازی کرتے ہیں جو گناہ آلود زندگی کی آتشِ سوزاں میں جل کر بھسم ہو گیا۔ تقریباً ایک صدی قبل تک سیوی کی تمام وادی جو مشرق تک پھیلی ہوئی تھی، جنگلات سے مزین تھی، لیکن سائنسی نظام اور قواعد و ضوابط کے فقدان کی بناء پر طبعی نروغ اور نشوونما کے عمل کے بجائے جنگلات تقریباً جڑوں سے اکھاڑے جا چکے ہیں۔

بابِ دوئم

بلوچ نسل کا کردار

توارث اور ماحولیات وہ بنیادی عوامل ہیں جو کسی فرد اور کسی نسل کے کردار کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں. توارث سے ہماری مراد، خصوصی نسلی، جبلی خصلتوں، روایات، رسومات، رواجی قوانین و دستور اور ضابطۂ اخلاق سے ہے ماحولیات سے ہماری مراد طبیعی، جغرافیائی اور موسمی حالات، سماجی تنظیم اور سماجی ربط سے ہے، جو ایسے بنیادی عوامل ہیں کہ کسی نسل کے اجتماعی کردار کی تصویر گری کرتے ہیں اگر توارث پر دوسرے عناصر و عوامل کا اثر و نفوذ کم ہو، تو انسان پر اس کی حقیقی فطرت حاوی ہوتی ہے اور وہ اس کرۂ ارض کے ان سب حصّوں میں، جہاں ابھی تک معاشرہ غیر فطری اور مصنوعی اختراعات و ایجادات سے پاک ہے، انہی خصوصیات کا مظہر اور انکی پرورش و فروغ کا حامل ہوگا.

ایران میں واقع کرمان سے لے کر پنجاب کی حدود تک تمام بلوچی سطح مرتفع ایک کوہستانی دفاعی حصار ہے. جو بیرونی جارحیت اور حملوں سے بالکل محفوظ اور ناقابلِ تسخیر قلعہ کی مانند ہے اور یہ نیم جاگیردارانہ اور پُر آشوب و شورش پسند طریقِ بقا کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہایت موزون و مناسب محل و مقام ہے یہ ایک قدرتی قطعہ ہے جسے فطرت نے اس کی خاطر جارحیت اور جنگجو یا نہ عزائم کے

مذاہب کے لئے تخلیق و تعمیر کیا ہے۔ بلوچی خطوں کی طبعی ساخت، مناظر قدرت اور آب و ہوا کی بوقلمونیوں، بیرنگیوں اور نشیب و فراز و تغیرات کے حسین امتزاج کا بیکر جمیل ہے جو بلندیوں اور ارتفاعات کے مطابق جنم لیتا ہے۔ اس میں میدانی علاقوں کی اعصاب شکن و ضعف افزا گرمی کی آتش سوزاں بھی ہے اور بلند و بالا کوہستانوں کی یخ بستہ ہواؤں کی سختی و تندی بھی۔ یہی اس قوم کی اکثر آبادی کی نسلی خصوصیات اور شوخ و ترش انداز، عادات و اطوار کی عکاس بھی ہے۔ اور یہی اس خانہ بدوشی، بدویت اور قبائل جاگیرداریت کے پُرافسون تجزیہ کی ذمہ دار بھی ہے جس کے وجود کا تمام مہذب ممالک و اقوام میں مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا ہے۔ بلوچستان حملہ آور فوجوں کا راستہ رہا ہے اور انسانی سیلابوں کے اس مدوجزر کے ساتھ ساتھ بلوچی سرزمین، اُن کی خوبیوں اور خرابیوں کا مدفن بنتی رہی ہے۔ مگر بلوچوں نے اپنی مؤثر و مستحکم کثرت کی بناء پر بیرونی اور اجنبی نسلوں اور قبیلوں کے آثار و خصائص کو امتیازی افراط و تفریط کا شکار ہو کر قطعاً قبول نہیں کیا۔ بلوچی معاشرتی ضابطۂ اخلاق

۱۔ ملاحظہ ہو: "غیر دریافت شدہ بلوچستان"
"The Unexplored Baluchistan" (۱۸۷۶)
(۱۸۷۶) (E. A. Floyer) از: ای۔ اے۔ فلائیر۔
(۱۸۸۱) A. Gasteiger از "Von Teheran Nach Baluchistan."
جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جلد سیزدہم (۱۸۴۴) حاجی عبدالنبی۔
سفرنامۂ بلوچستان افغانستان وغیرہ از میسن
(Masson) (۱۸۴۴، چار جلد لندن) Travels in Baluchistan Afghanistan etc.
مشرقی ایران "Eastern Persia" دو جلدیں ۱۸۷۶۔ از جان لوٹ (John Lovett)

ہمیشہ بیرونی اور اجنبی رسوم و رواج کے اثر و نفوذ سے بالاتر ہی رہا۔ ممالک شرقیہ میں بدوی اور خانہ بدوشانہ زندگی، نسل اور سیاست سے قطعی آزاد، کچھ مشترکہ خصائص کی مظہر ہوتی ہے اور یہ خصائص ان کی نظم و ضبط اور کردار کا نتیجہ ہیں۔ بدوی زندگی مستقل آزمائشوں اور مصائب کا مرقع ہوتی ہے اور ایک خانہ بدوش سدا تیز تگی ہائے قدرت سے ستیزہ کار ہی رہتا ہے۔ فنِ مدافعت، بے لوث اخلاص بہادری، بردباری، سادہ عادات و اطوار اور مہمان نوازی وہ خوبیاں ہیں جن سے بدویت کی وسیع درسگاہ میں فطرت کی اتالیقی سے بلوچ مزین اور آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے[۱]۔ بلوچ عوام میں قبائلی عصبیت کی حس انتہائی مستحکم و مضبوط ہے۔ قبیلہ خاندان، برادری، دیہہ، فرودگاہ اور ڈیرہ کے سربراہ کی اطاعت و فرمانبرداری ہمیشہ سے اور ہر جگہ اس کا شیوہ و وطیرہ رہا ہے۔ وہ مدنی زندگی کی بدمعاشیوں، عیاشیوں اور برائیوں کی آلودگی سے پاک و منزہ، سادہ لوح اور معصوم و بے ضرر ہیں۔ بلوچ تخت و دولت کی پیداوار، بغاوت، حرص و طمع اور موقع پرستی جیسی لعنتوں کے تمام داغ دھبوں سے پاک و صاف ہیں۔ وہ سخت و جفاکش، تند و تیز اور جاہل و بے علم ہیں۔ مذہب سے ناآشنا ہیں مگر اپنے ممتاز نسلی افتخار سے سرشار ہیں جس کا مظاہرہ قبائلی جنگوں میں ہوتا رہتا ہے جن میں سفاکانہ خونریزی و غارت گری سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ بقول میین: "بلوچستان کے قبائل معاشرے کے، وسیع پیمانے میں خواہ علم و دانش کی ترقی کا میدان ہو یا زندگی کے آداب سے آگاہی کا معاملہ ہو، کم تر رتبے کے حامل ہیں۔ مگر خطاکاریوں اور بے اعتدالیوں کے باوجود جو جہالت اور وحشیت کی حالتِ زار کے تبیوۂ عمومی ہیں، ان کی کچھ اچھی فطری خوبیاں ہیں۔ اور

۱۔ ملاحظہ ہو: بلوچ نسل و بلوچستان کی تاریخ، از: سردار خان بلوچ

ان کی بہت سی خوبیاں بظاہر تہذیب کے چتر شاہی و سائبان کے بجائے جو وہ اپنی پروسٹے سروں پر پھیلائی ہیں، کسی غیر مہذب وحشی کے پنکھ تلے زیادہ تابندہ و درخشاں شان و شکوہ اور قوت کے ساتھ پروان چڑھتی اور جلا پاتی ہیں۔"

بلوچ انسانی نسلوں کی اس صف میں شمار ہوتے ہیں جو ایک اکمل ترین طبیعیاتی و جسمانی تنظیم کی مظہر ہے اور بلوچوں کا "انسانی ذہنی خوبیوں کے بجائے جسمانی خوبیوں کی جانب رغبت اور لگاؤ"، اس نسل کی اجتماعی فلاح و بہبود کیلئے زہر ہلاہل ثابت ہوا ہے۔ وہ رفتارِ زمانہ سے بے نیاز وقت کے کرگھے کی حرکت پر سبک روی اور آہستگی سے رواں دواں ہیں۔ کبھی کبھار اس کے آہنی پہیوں کی گرج اور سخت دباؤ کے باعث، ان کے ادراک و توجہ میں معمولی سا ارتعاش ہی پیدا ہوتا ہے۔ جاگیرداریت و قبائلیت کے قابلِ نفرین نظام نے بارہا ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف صف آرا کر دیا، ایک سردار کو دوسرے سردار سے برسرِ پیکار رکھا، اور اس طرح کے انفرادی و قبائلی بغض و عناد نے ان سرداروں کو تہی دامن اور چور چور کر دیا جو واقعی اس شرمناک اور ضرر رسان اعزاز کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ انہوں نے اِس نسل کی قوت و طاقت کو اپنی ہلاکت خیزیوں سے تہس نہس کر کے چھوڑ دیا۔ کسی بھی بلوچ سردار کے لئے اپنے قبائلیوں میں خون خرابہ، خانہ جنگی، قتل و غارت، کشمکش، فتنہ انگیزی، ناچاقی اور مخاصمت کے خصائل کے فروغ اور انگیخت سے زیادہ کوئی اور محبوب مشغلہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرنہا قرن سے یہ قبائل بصد شوق و ذوق جنون کی حد تک اپنی قوتوں کو

۱۔ قلات کا سفرنامہ ص۲۱۸

"NARRAIW OF A DOURNEY TO KALAT"

باہمی کشت وخون اور جنگ وجدال میں بیہم ضائع کرتے رہے ہیں۔ سردار بلوچ معاشرے کی نگرانی وپاسبانی کے اعلیٰ رتبے کے مالک ہوتے تھے اور اپنے اپنے قبیلوں کے فوجی، انتظامی اور عدالتی سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ تاریخ ایسے حکمرانوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جو اپنی مطلق العنان قوت وطاقت کے بل پر زیادہ تر روحانی مسندوں پر براجمان ہوتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے تحت پوری بلوچ نسل سرداریت کی آمرانہ شقاوت وسفاکیت کی چکی میں پستی رہی جو فرسودہ روایاتی خیالات کو ان پر یہ جبر وقہر مسلط اور مروج کرنے کا باعث تھی اور ان کو ذہنی آزادی کا کوئی موقع فراہم نہیں ہونے دیا گیا۔ حقیقی صورت حال تو یہ ہے کہ قبائلی سرداروں کو ناپسندگی کی نظروں سے دیکھتے ہیں، لیکن بایں ہمہ جب بھی ان کو مکمل تعاون کرنے کے لئے دعوت دیجاتی ہے، تو ان قبائلیوں کا موزون اور برمحل فوری ردِ عمل یہی ہوتا ہے کہ "اے بلوچو! پہاڑ تمہارے قلعے ہیں"[1] دراصل قبائلیت اور جاگیرداری ہمیشہ پوری بلوچ نسل کے لئے طوقِ لعنت ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ انہی کی بدولت وہ مختلف متصادم ومتحارب گروہوں میں منقسم ہوتے رہے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہ ایک ایسا انتظامی نظام ہے جس میں سب اداکار یعنی قبائل اور قبائلی سردار دونوں، مختلف صورتوں میں راشی اور مرتشی قرار پاتے ہیں۔ اس نظام میں ذاتی اور انفرادی احساسِ ذمہ داری، خودداری اور وقار کا فقدان ہوتا ہے۔ سرداروں کے درمیان باہمی اعتماد، ہم آہنگی اور تعاون کی فضا قائم نہیں رہتی۔ اس نظام کو مستحکم کرنے کے معنی یہی ہوں گے کہ کسی ایسے تنے پر نئے قلموں کی پیوند کاری کی سعیٔ لاحاصل کی جو پہلے ہی خشک ہو چکا ہے۔ بلوچ نسل کے کردار میں آج تک

۱۔ ایک بلوچی نظم کے اس مصرعے کا ترجمہ "کوہ انت بلوچانی قلات" مترجم

بہت کم ہی تبدّل و تغیّر آیا ہے۔ جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچ نسل اور اس کے دُور افتادہ خطوں پر وقت و زمانے کے اثرات نہایت سُست رفتاری سے پڑے ہیں۔ اقصائے عالم میں مختلف نسلیں وجود میں آتی رہیں اور فنا ہو کر ان کے نام و نشان اور نقوش تک مٹ گئے۔ اور ان میں تغیّرات و تبدّلات نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ مگر بلوچوں کے اُس زاویۂ نگاہ، جذبۂ افتخار اور ان مروّجہ رسوم و رواج میں زمانے کے نشیب و فراز نے کوئی تغیّر و تبدّل رُونما نہیں ہوا ہے جن کے وہ "ہلالِ زرخیز" بابل کے آقا و حکمران کے وقت حامل تھے۔[1]

قابلِ احترام و صاحبِ جلال کلدانیوں کا پُر افتخار ورثہ، بلوچوں کے رگ و پے میں ابھی تک اپنی پوری توانائی و تحرّک کے ساتھ رچا بسا ہے۔ جدید تمدّن نازک خرامی سے، بلوچ نسل کی سماجی تنظیم کو اپنی تابناک اور روشن شعاعوں سے مستقل طور پر متأثر کر رہا ہے۔ اور اب یہ پیشگوئی نہیں کی جا سکتی کہ بلوچوں کا پر افتخار روایاتی ضابطۂ حیات کب تک اس پُر خطر و قابلِ نفرین تند و تیز یورش و یلغار کے مقابلے کی تاب لانے کا متحمّل ہو سکتا ہے۔ ایک بلوچ بہر حال اپنے قدیم سامی آباؤ اجداد کا نجیب و شریف نمونہ و تمثیل ہے۔ سر ولیم اوسلے رقمطراز ہے۔ کہ اس کی رائے میں بلوچ نسبتاً حجازی عربوں میں سے ہیں۔[2] وہ ان کے کردار کا حجازی عربوں سے تقابلی تجزیہ کرتا ہے اور ان کو ایک جیسا قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں جنگجو اور جانباز ہیں۔ دونوں رہزنی و غارت گری کے دلدادہ و خوگر ہیں اور

۱۔ بلوچ نسل کے حسب و نسب کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ "بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ از: سردار خان بلوچ۔ باب اول

۲۔ بحوالہ "برہان قاطع"

خون ریزی، قتل و غارت، بربریت اور دہشت گردی کے شوقین ہیں جیسا کہ ابن خلدون نے حجازی عربوں کو اہلِ الحجر یعنی پہاڑوں کے مکین کے نام سے یاد کیا ہے [1]

بلوچوں میں عالی نسبی اور اعلیٰ و برتر خونی افتخار و جذبہ، انتہائی حد تک موجود ہے۔ بنی نوع انسان کے معاشرتی دفتر کے اوراق میں بلوچ اپنے آپ کو سرفہرست تصور کرتے ہیں۔ وہ برتر و بلند نسلی افتخار کے اس افسون سے سرشار ہیں کہ بلوچ ایک شاہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی رگوں میں خسروانہ خون رواں دواں ہے۔ حتیٰ کہ محدود وسائل کا حامل ایک معمولی بلوچ بھی، عالی عزت نفس کے نشے سے اس قدر مخمور و سرشار نظر آتا ہے کہ وہ عالی فخر و افتخار اور قول و قرار کے معاملات میں وہ پورے تیقن و رُعب کے ساتھ اپنے سر کی سوگند ان الفاظ میں لیتا ہے۔ کہ "سلطانیں سرء سوگندانت" (شاہی سر کی قسم ہے) وہ اپنا ثانی اور مساوی و ہمسر اپنے خونی رشتوں میں ہی تلاش کرتا ہے۔ اس سے قطعِ نظر، کہ ان کے اس دعویٰ میں کتنی صداقت ہے، ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے خون کو آلودگیوں اور آمیزشوں سے پاک و صاف رکھا اور اپنے امتیازی کردار کو برقرار رکھا۔ ایک عام بلوچ کے خیال میں، خون اور حسب نسب کی پاکیزگی، اجتماعی اور انفرادی زندگی کی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے باعث اجنبی اور غیر نسل اور خون کے اختلاط و امتزاج سے زوال، ذلت، پستی انتشار اور فساد کو یقیناً دعوت ملتی ہے۔ شجرۂ نسب کو ازبر کرنا، ہمیشہ سے ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور تا حال یہی صورتِ حال باقی ہے۔ کسی نسل نے، بالاستثنائے عربوں اور بلوچوں کے، حسب نسب کے شجرہ کو، باوثوق تاریخ کے معیار و درجہ تک نہیں پہنچایا ہے۔ ایک صحیح و اصیل

۱۔ مسالک و ممالک از ابن حوقل۔ مترجمہ: سر ولیم اوسلے

اور نجیب الطرفین بلوچ سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شجرۂ نسب کو گذشتہ کئی پشتوں تک یاد رکھ کر بتائے۔ وہ صنفِ نازک کے ننگ و ناموس کے بارے میں انتہائی حساس، جذباتی، سخت اور ضدی واقع ہوئے ہیں۔ صنفِ نازک کے گھر میں محبوس داشتاؤں کا کردار ادا کرتی ہے اور محنت مشقت اس کا مقدر ہے انہیں گھروں میں اسطرح رکھا جاتا ہے کہ ان کی ہمسری کرنے اور ہم پلّہ ہونے کا کوئی بھی دوسرا فرد دعویٰ نہ کر سکے، جبکہ ان کے قنوطی، پُرحسد اور شکی مزاج آقا ہمیشہ چوکس ہو کر ان کے مسکنوں اور ان کے ننگ و ناموس کی حفاظت کرنا اسطرح اپنا فرضِ منصبی تصور کرتے ہیں جسطرح کہ کوئی باز اپنے گھونسلے اور آشیانے کے اوپر منڈلاتا رہتا ہے۔ اپنے قریبی رشتہ داروں میں شادی بیاہ کے رواج پر مکمل طور پر اور انتہائی سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی خاندان کی لڑکی کو اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیجاتی اور کبھی کبھار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اس بیچاری کو طوعاً و کرہاً اپنے کسی قریبی عزیز کی کئی بیویوں میں سے ایک بیوی بننا پڑتا ہے، یا عمر بھر کنواری رہ کر زندگی بسر کرنے پر قانع ہونا پڑتا ہے۔" بلوچوں میں طلاق کا رواج کم ہے کیونکہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی سزا موت ہے اور دیگر وجوہات کی بنا پر اپنی بیوی کو چھوڑنا انتہائی معیوب تصور ہوتا ہے۔ بے حیائیاں اور بدکاریاں دنیا کے گوشے گوشے میں ہر نسل کے لوگوں میں پائی جاتی ہیں، لیکن کسی فخر و مباہات اور تعصب کے بغیر، بالوثوق طور پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ بلوچ ننگ و ناموس نے، اس نسوانی جنس زدہ دور میں بھی، قوم خانوں میں اپنی خواتین کی عصمت و عفت کا بر سرِ عام نیلام ہونا کبھی گوارا نہیں کیا، جیسا کہ

۱۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر سیریز جلد سوئم۔ ضلع سبی صفحہ ۳۶

دوسری نسلوں کے لوگوں میں اس خوئے بد کا رواج ہے۔ کوئی بھی فرد اور کسی نسل کے لوگ اس مثبت اور اظہر من الشمس صداقت کی تردید اور اسے جھٹلانے کی جسارت نہیں کرسکیں گے۔ ان پر عظمت اور پر شکوہ کلدانیوں کے اخلاف ہونے کی حیثیت سے، جنہوں نے حکمرانوں کی نسل کے طور پر، قرن ہا قرن تک اپنی عظمت کا سکہ جمایا اور اپنی طاقت کا لوہا منوایا اور دنیا کی اوّلین تہذیب کی بنا ڈالی، بلوچ، اپنے نسلی افتخار و برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہیں اور اپنے کو ایک امتیازی، معزز، قابلِ تعظیم و تکریم نسل کے فرد تصوّر کرتے ہیں۔ ایک بلوچ، سامیوں کے علاوہ کسی بھی دوسری نسل کے افراد کو اپنا ہمسر و ہم پلّہ تصوّر نہیں کرتا۔ اس کی شجاعت، فیاضی، وفاشعاری، احساسِ افتخار اور جذبۂ رشک، اس کی بہترین اور بدترین خصوصیات رہی ہیں۔ رِند قبیلے کی یہ خود پسندانہ اور متکبرانہ ضرب المثل، ان کے کبر و نخوت کی معراج کی دلالت کرتی ہے کہ "ایک جام، جام تو ہوسکتا ہے مگر وہ نسلاً ایک جدگال ہے اور اس لئے وہ سلطان صفت بلوچوں کا ہمسر و ہم پلّہ نہیں ہوسکتا"[1] کبر و نخوت کی یہ انتہا پسندی، مستقل طور پر، ہر بلوچ کے لئے ایک لعنت ثابت ہوئی ہے۔ وہ سیاسی، معاشرتی اور زندگی کے دیگر میدانوں میں اپنے ہی خون سے اپنے لئے ایک ایسے ہم پلّہ اور مدّمقابل کی جستجو میں مگن رہتا ہے تاکہ اس سے وہ اپنے بُغض و کینہ کی آگ بجھا سکے۔ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ ہر بلوچ ایک دوسرے بلوچ کے لئے مُستقل خطرہ بنا رہتا ہے، بلکہ مختصر الفاظ میں ہر بلوچ، ضدِ بلوچ ہوتا ہے۔ ہم ایک پُرانا واقعہ بیان کرینگے جس سے اُس رُوح اور فطرت کی پوری وضاحت ہوگی جو بلوچی زندگی پر ماضی میں حاوی اور مسلّط رہی ہے اور حال میں بھی یہی عالم ہے۔

۱۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر سیریز جلد ہفتم، مکران۔ از: ہوگز بُلر صفحہ ۲۰۰

اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں گشکوری قبیلے کے بزسری شاخ کے قیصرانی بھاڑے کے سات افراد ایک مرتبہ کسی سفر پر روانہ ہوئے۔ بلوچی دستور کے مطابق انہوں نے بھیڑ کی کھال کی ایک تھیلی (القان) میں گندم کا آٹا بھر کر ساتھ لیا۔ دورانِ سفر ستانے کے بعد، انہوں نے روٹی پکانے کا ارادہ کیا۔ اس دوران میں ان کی لاعلمی میں اتفاقاً ایک زہریلا سانپ آٹے کی تھیلی میں کسی طرح گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان ساتھیوں میں سے ایک نے دوسرے ساتھی سے کہا کہ وہ تھیلی سے آٹا نکال لائے۔ وہ تھیلی کے پاس گیا اور آٹا لینے کی خاطر ہاتھ اندر ڈالا تو سانپ نے ڈس لیا۔ اس نے کسی کو کچھ بتائے بغیر خاموشی سے اپنا ہاتھ تھیلی سے باہر نکالا اور ایک دوسرے ساتھی کو آٹا نکالنے کے آواز دی دوسرے ساتھی نے جب اپنا ہاتھ تھیلی میں ڈالا، تو اس کو بھی سانپ نے ڈس لیا اس نے بھی خاموشی اختیار کی اور اپنے ساتھیوں کو کچھ بتائے بغیر اپنا ہاتھ باہر نکال کر کسی اور ساتھی کو آٹا نکالنے کے لئے کہا۔ اسطرح کی متواتر رذیلانہ خاموشی اور پردہ پوشی، کینہ پروری اور تنگ مزاجی کی بدولت، جب ساتویں ساتھی کی باری آئی اور اس نے اپنا ہاتھ تھیلی میں ڈالا، تو اس نے چیخ مار کر حقیقتِ حال عیاں کر دی۔ تب ان سب ساتھیوں نے اظہار کیا کہ ان کا پہلے ہی یہی حشر ہوا ہے آخر کار سب نے وہیں جان دے دی اور یہ ہولناک حادثہ اب صرف دوسروں کو سنانے کے لئے ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس نوع کی انفرادی اور اجتماعی لعنتوں اور خواہشِ بد نے بلوچی اتحاد اور قیادت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، جس کا حتمی نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے کہ گردشِ دوران و تقدیر نے بلوچ عوام کی سرزمین پر غیروں کی سرداری، سیادت، تلروئی اور سرکردگی کی راہ ہموار کر دی اور انہوں نے بلا تامل و تردد، ان کے اقتدار و اختیار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ ان

غیر خاندانوں کے سلاطین کے طور پر، بمپور کے بارکزئیوں کی سرداری[1]، مکران میں گچکیوں[2] کی سرداری، خاران میں نوشیروانیوں[3] کی حکمرانی اور لسبیلہ میں جاموٹوں[4] کی حکومت، جو ان غیر خاندانوں کے سلاطین کی حکومتوں کے علاوہ ہیں جنہوں نے صدیوں تک بلوچ قبائل پر اپنی حکومتیں اور سیادتیں قائم کرلی تھیں۔ بلوچوں میں افراتفری، ہنگامہ پروری عدم تنظیم اور اتحاد کا فقدان، ایسے خصائل ہیں جو ان کی انحطاط پذیری اور زوال کی تاریخ کو انشان وطشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں۔ جسمانی طور پر بلوچ من حیث القوم مضبوط و توانا قویٰ کے مالک لوگ ہیں۔ جن میں سماجی نقطۂ نگاہ سے اجتماعی طور پر غیر اثر پذیری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مگر سیاسی لحاظ سے وہ مسلمہ طور پر ایک ایسی غیر متحد قوم ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

مہمان نوازی اور بہادری بلوچوں کی میراث ہے[5] فیاضی اور سخاوت ان کے

۱۔ بمپور کے بارکزئی سرداروں کا سلسلۂ حسب نسب، قندہار کے درانی افغانوں کی بارکزئی شاخ سے جاملتا ہے۔

۲۔ مکران کے گچکی ہندی النسل ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ۔ از: محمد سردار خان بلوچ۔

۳۔ خاران کے نوشیروانی، ایرانی نژاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر وہ منگولوں کی نقودری شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴۔ لسبیلہ کے جاموٹوں کا تعلق، ٹوانہ گڑھ کے راجپوتوں سے ہے۔

۵۔ کشورِ بلوچستان "A COUNTRY OF BALUHISTAN" از: اے ڈبلیو۔ ہوگس (A. W HUGES) صـ۴۱

سرحد کے پار "ACROSS THE BARDER" از: اولیور (OLIVER) صـ۲۵

رگ رگ میں رچی بسی ہے۔ انتقام جوئی پران کا کامل ایمان ہے اور وفا شعاری ان کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہے۔ بلوچی کردار ہمسایہ نسلوں سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔ ایک بلوچ فتح وشادمانی کا عالم ہو یا شکست و آلام کی گھڑی، ہر حال میں بہادری و شجاعت مستقل مزاجی و استقامت، متانت و سنجیدگی اور وقار و عزت اور بے خوفی و بے باکی کے دامن کو تھامے رکھتا ہے۔ وہ برائیاں اور بری خصلتیں جو کسی شخص میں، اس کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنے کے باعث، جنم لیتی ہیں اور پرورش پاتی ہیں، ایک عام بلوچ میں قطعاً مفقود ہیں تاریخ کسی بھی ایسی مثال اور نظیر سے تہی دامن نظر آتی ہے کہ بلوچوں نے کسی شکست و سقوط، تباہی و بربادی یا مصائب و آلام کے کسی سانحے کے وقت، ذلت و پستی اور بزدلی کے ساتھ سر تسلیم خم کیا ہو۔ کسی بلوچ کے لئے لڑ کر جان دینا موت کو شکست دینے کے مترادف ہے جبکہ موت سے لرزہ براندام ہونا اور آنکھیں چرانا، بزدلانہ زندگی تصور ہوتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں جب تمام اقوام عالم نے، باجماعت اتحادیوں کی صورت میں، خون خرابہ کے درپے ہو کر جرمنی کے خلاف معرکہ آرائی کا پرچم بلند کر کے، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا راستہ اختیار کیا، تو برطانوی حکومت نے مری قبیلے سے بھرتی کے لئے لوگوں کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے بھرتی کے لئے قبائلیوں کو پیش کرنے سے قطعاً انکار کر کے ان سے جنگ چھیڑ دی۔ ایک ڈویژن پر مشتمل برطانوی لشکر جرار نے، جو ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھا، جنرل ہارڈی (HARDY) کے زیر کمان، مری علاقے کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان پر حملہ بول دیا۔ یہ جنگ چھ مہینوں تک جاری رہی۔ اس ہولناک اور تباہ کن جنگ سے مری قبیلے کے شدید مصائب، تباہی اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ سینکڑوں گاؤں بمباری اور آتش زنی سے خاکستر اور ویران ہو گئے۔ اس قبیلے کے مرکزی مقام کاہان میں، ایک دربار کا انعقاد کیا گیا اور بلوچستان کے اس وقت کے اے جی جی اور چیف کمشنر نے قبائلیوں کے سامنے خطاب کیا۔ دربار کے بعد، ایجنٹ ٹو گورنر جنرل نے

مری قبیلے کے سردار، نواب خیر بخش خان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: "خوب! اب آئندہ مری، برطانوی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی کبھی جرأت نہیں کریں گے!" نواب صاحب موصوف نے برجستہ ترکی بہ ترکی یوں جواب دیا: "ہاں صاحب! برطانوی بھی بھرتی کے لئے آئندہ کبھی لوگوں کا مطالبہ کرنے کی جرأت نہیں کرینگے۔"

۱۸۹۸ء میں میر بلوچ خان نوشیروانی نے مکران میں برطانوی سامراج کے خلاف کھلم کھلا اور علی الاعلان جہاد کا پرچم بلند کیا۔ بلوچوں نے تربت کے قلعے پر قبضہ کرلیا اور کولواہ کے پہاڑوں میں کیپٹن برن (BURN) کی سروے پارٹی پر ہلہ بول دیا۔ اس جماعت کے بہت سے لوگوں کو تہہ تیغ کرکے بڑی مقدار میں سرکاری اموال کو لوٹ لیا۔ پسنی کی بندرگاہ کو تاخت و تاراج کیا اور پسنی اور گوادر کے درمیان، ٹیلی گراف لائن کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا۔ کرنل مین (MAYNE) کے زیر کمان کراچی سے چار سو نفری پر مشتمل پیدل فوج کا ہر طرح سے مسلح ایک مضبوط دستہ، ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ تربت کے جنوبی جانب، گوک پردش کے تنگ درّہ میں بلوچ ان کا راستہ روک کر، ان کے سامنے سینہ سپر ہوگئے، آخرکار ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ برطانوی فوج نے اپنے دشمنوں کو چار جانب محاصرے میں لیا تھا۔ وہاں جانیں بچانے کی کوئی امید باقی نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ مصالحت پر آمادگی کا اظہار کیا جائے، ہتھیار ڈالے جائیں یا جنگ کرکے مردانگی سے موت کو گلے لگایا جائے۔ میر بلوچ خان کو ہتھیار ڈالنے کی صورت میں، ہر طرح کی مراعات دینے اور عزت و وقار کے ساتھ پیش آنے کی ہر ممکن یقین دہانی اور پیشکش کی گئی۔ اور وعدے کئے گئے۔ مگر اس شیر دل جانباز نے ان سب کو برملا ٹھکرا کر ان پر میدان کارزار میں صف آرا ہوکر دادِ شجاعت دینے کو ترجیح دی۔ وہ عزم و استقلال کا آہنی پیکر بن کر دشمن کو آتشین گولے کی مانند اڑا دینے پر کمربستہ ہوگیا اور تذلیل و پستی کی زندگی سے شہادت کی موت کو خوش آمدید کہنے پر تل گیا۔ آخرکار ایک خون ریز جنگ کے

بعد اس نے اپنے ایک سو پچاس ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا اور اپنے تمام شہید ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار ہی میں مدفون ہوا۔ گوک پروش کا میدان جنگ اور بلوچ سرفروشوں کے مزارات، آج بھی بلوچ شجاعت و دلیری اور عزم و استقلال کے انمٹ نقوش اور بے مثال یادگار ہیں۔ اور آئندہ نسلوں کو یہ سچا سبق دیتی ہیں۔ کہ جنت کا دائمی امن و سکون ان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ جو اس کی صحیح، جائز اور منصفانہ جنگ کے لئے تلواریں سونت لیتے ہیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے وسط میں بلوچوں کے ٹائیبیریئس[1] (TIBERIUS) اور مرد مجاہد، کابوس و پاسبان سندھ، میر بجار ڈومبکی نے برطانوی استعمار کی قوت و جبروت کو للکارا۔ جب برطانوی ارباب اختیار نے اسے نوابی کے خطاب کے علاوہ، ایک بہت بڑی جاگیر کا لالچ بھی دیا۔ لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے تحریص و ترغیب کی ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا کہ "ایک بھوکے شیر کا جنگل میں بسیرا کرنا، ایک لومڑی کی طرح کسی محل و ایوان میں محبوس ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔" اور اپنے قول کی صداقت ثابت کرنے کی خاطر، زندگی بھر برطانوی استعمار کی جارحیت اور ناانصافیوں کے خلاف برسرپیکار رہا۔[2]

اب ہم بلوچوں کے بارے میں ان انگریزوں کے تذکروں کا بیان کریں گے جنہوں نے تقریباً ایک صدی تک بلوچستان اور سندھ میں بلوچوں کے ساتھ زندگیاں گذاریں، ان کے ساتھ جنگیں لڑیں اور ان پر حکمرانی کی۔ حزب مخالف اور اعداء کی جانب سے

۱۔ ٹائیبیریئس مشہور و معروف رومن جرنیل اور شہنشاہ تھا جس کا پورا نام ٹائیبیریئس کلاڈیئس نیرو سیزر تھا جو سنہ ۱۴ء تا سنہ ۳۷ء تک قیصر روم رہا۔ مترجم

۲۔ ملاحظہ ہو: "Dry Leaves from Young Egypt"
از: ایسٹ وک (EAST WICK)

تبصرے اور ان کے تاثرات، عموماً تعصب اور جانبداریت سے مبرا اور حقائق کی عموماً صحیح نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان کے یہ بیانات صرف سطحی اور خود فریبی کے مظہر نہیں ہیں بلکہ وہ آزمائشوں اور امتحانوں کے نشیب و فراز میں خود گزرے ہیں اور سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ انہوں نے زہر ہلاہل نوش کرنے کے بعد، غیر جانبدارانہ رویہ کے ساتھ کھوٹے اور کھرے کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے اور ان کے درمیان فرق و تمیز کیا ہے، انہوں نے ملمع کاری اور تصنع سے اپنا دامن پاک رکھا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "بلوچ، اپنے ہمسایہ پٹھانوں سے کئی پہلوؤں سے قطعاً مختلف اور بالکل متضاد ہیں۔ ہر ایک کی سیاسی تنظیم قبائلی نوعیت کی ہے جن میں سے ایک تو اپنے سردار کی، جو کہ محدود پیمانے پر ایک بادشاہ کی طرح ہے، انتہائی وفادار اور اطاعت گذار ہے جب کہ دوسرا قبیلے کے جرگہ کے علاوہ کسی دوسرے کے اختیار و اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ دونوں میں بدویت اور نیم مہذب زندگی کی مخصوص اکثر خوبیاں اور بہت سی خرابیاں موجود ہیں۔ دونوں میں مہمان نوازی ایک مقدس فریضہ ہے اور مہمان کو تحفظ دینا، فرائض منصبی میں شمار ہوتا ہے۔ دونوں کے افراد "خون کا بدلہ خون" کے اصول پر عمل پیرا ہونے کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتے ہیں۔ دونوں اپنے ضابطۂ اخلاق کی سختی سے پیروی کرتے ہیں۔ لیکن ایک (بلوچ) اپنے قول و قرار کا پاس رکھتا ہے مگر دوسرا (پٹھان) اپنے مفادات کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ اور بلوچوں میں مذہبی جنون، پٹھانوں کے مقابلے میں کم ہے۔ ان کے عقیدے میں خدائی احکامات کا وجود کم ہے اور سرشت و طبیعت میں شیطانی صفات (بھی) کم ہیں۔ اس (بلوچ) کی اپنے شمالی ہمسایہ (پٹھان) کے مقابلے میں جسمانی ساخت کمزور اور دبلا پتلا ہے مگر تندی اور سختی میں بلا ہے۔ وہ اپنی عادات عادات و اطوار میں راستباز اور صاف گو ہے۔ کمینگی اور غلامانہ ذہنیت کا حامل نہیں۔ وہ بالکل حقیقت پسند اور راستگو ہوتا ہے بشرطیکہ اسے ہماری

(انگریزی) عدالتوں نے بدخوئی پر مائل نہیں کیا ہو۔ وہ اپنے عہد و اقرار کا پابند ہوتا ہے وہ معتدل مزاج اور اولوالعزم ہوتا ہے اور باہمتی اور مردانگی کو سب سے بڑی خوبی سمجھتا ہے۔ اور ڈیرہ جات کی سرحدوں کا حقیقی بلوچ ان بہترین خوش طبع لوگوں میں سے ہے۔ جن کے ساتھ پنجاب میں ہمارا واسطہ پڑا ہے۔"[1] ایک مشہور و معروف برطانوی مدبر اور سیاستدان، ان دو نسلوں یعنی بلوچوں اور پٹھانوں کے کردار کا تنقیدی نقشہ پیش کرتے ہوئے، اپنے تابناک تجزیہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے: "اگر ہم افغان یا آفریدی کو شمالی نمونہ و تمثیل کے طور پر لے لیں، اور رند بلوچ (عربی النسل) کو جنوبی نمونہ و تمثیل کے طور پر لے لیں، تو گذشتہ اہلِ قلم نے ان کے درمیان جو امتیازات قائم کر رکھے ہیں، وہ عمومی طور پر درست ثابت ہوتے ہیں۔ بلوچوں کے ساتھ، ان کی قبائلی تنظیم، متعصب مذہبی جنون اور کٹڑپن سے آزادی اور اپنے ملا کی کورانہ تقلید سے عدم وابستگی کی بنا پر، معاملات طے کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا، پٹھان کے مقابلے میں آسان ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کی، جس کے، پٹھانوں کے مقابلے میں ان کے قبائلی جرگوں کی نسبت سے زیادہ وسیع و مضبوط اور مؤثر اختیارات ہیں، زیادہ احترام اور قدر و منزلت کرتا ہے۔ پٹھان کٹر حد تک جمہوری ہے، اس کے ہر فرد میں ایک قانون مضمر ہے۔ اور اگرچہ وہ حد سے زیادہ ملا کے اثر و نفوذ میں ہے، مگر ہمیشہ، حتیٰ کہ مذہبی لڑائیوں میں بھی اس کی نظریں سودا بازی پر لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ دونوں جنگجو اور غارت گری میں طاق ہیں۔ مگر ان کے حربی قواعد و ضوابط اور طریقہ ہائے کار، قطعاً

۱۔ پنجاب کی مردم شماری رپورٹ میں لوگوں کی نسلوں، ذاتوں اور ان کے قبائل کے بارے میں باب مطبوعہ ۱۸۸۳ از: آنجہانی سر ڈنزیل ابسٹن (DENZIL ABBISTON) صفحات ۴۱ - ۴۲

مختلف ہیں۔ خواہ وہ آپس میں باہمی قبائلی لڑائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ بلوچ برسرِ عام کھلم کھلا اور بالمقابل لڑتا ہے۔ بلوچ جنگجوؤں میں ایک مخصوص نوعیت کے سخت نظامِ عزم اور شجاعت کا رواج ہے؛ جو ہر لحاظ سے ایشیا کے عرب فاتحوں کی لائق اولاد کہلانے کے مستحق پاتے ہیں۔ پٹھان اپنے مقصد کے مطابق کوئی بھی چال چل سکتا ہے۔ اور حیلہ و مکر سے کام لے سکتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کے عزیز و اقارب کو قتل کرنے کے فوراً بعد، بلکہ اس سے بھی زود تر، اپنے عزیز و اقارب کو بھی ہلاک کر سکتا ہے اور وہ ان کو عقب سے نشانہ باندھ کر مار دیگا۔ البتہ انفرادی طور پر کسی پٹھان کے نمک حلال ہونے اور اپنے قول و قرار پر پورا اترنے پر اعتبار و انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اپنا ایک ذاتی ضابطۂ اخلاق ہے جو نہایت عیارانہ ضابطہ ہے، جسے اچھی طرح سمجھنا اور پرکھنا چاہیئے۔ جسمانی لحاظ سے ان دونوں نسلوں کے بہترین نمائندوں کے انتخاب میں معمولی اور غیر اہم فرق ہے۔ یہ انتہائی مشکل امر ہوگا کہ مری اور بگٹی قبائل کے کسی سردار کے شاہانہ وقار و تمکنت اور اس کی بارعب اور پرشکوہ مؤثر موجودگی اور رونق افروزی کا کوئی ہم پلہ پیش کیا جا سکے جب وہ صاف و عمدہ لباس زیب تن کئے ہوئے (ایسا صرف درباروں کے موقع پر ہی ہوتا ہے) اچھی طرح سے تیل لگے ہوئے بالوں کی لمبی لٹوں کے ساتھ، خوب صیقل شدہ خنجر، تلوار اور ڈھال پر مشتمل اسلحہ کو اپنے کندھوں اور جسم کے ساتھ آویزاں کرتے ہوئے مزین ہو کر جلوہ افروز ہو، تو وہ ایک ایسی پرکشش، مؤثر اور عمدہ شخصیت کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ جس کی نظیر، شاذ و نادر ایشیا میں مل سکے۔ اس کی سامی شکل و شباہت بدوؤں سے ملتی جلتی ہے اور وہ اپنے آپ کو سینہ تان کر ایسا سیدھا اور بلند و بالا رکھتا ہے جیسا کہ نجد کا کوئی امیر ہو۔"[۱]

۱: ہندوستان کے سرحدی علاقے "THE ANDIAN BORDER LAND"
از: کرنل سر ٹی۔ ایچ ہولڈیچ : صفحات ۱۸۴ - ۱۸۵

ایک دوسرا انگریز مدبر اور ماہر سیاسیات، ڈیمیٹریئس (DEMETRIUS) بلوچوں کی بہادری و شجاعت کو اپنے مخصوص انداز میں تسلیم کر کے، ان کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرتا ہے: "اس پالیسی کا تیسرا اقدام یہ ہوگا، جس کے لئے محدود دفاع کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے، کہ دس ہزار بلوچوں پر مشتمل ایک فوج کی تشکیل کی جائے جو شاید ایشیا کے بہترین جنگجو اور لڑنے والے لوگ ہیں، تاکہ زاروں کے ترکمانوں کے مقابلے میں توازن قائم رکھا جاسکے۔"[1] میانی کی جنگ (۱۸ر فروری ۱۸۴۳ء) نے سندھ پر بلوچوں کے اقتدارِ اعلیٰ کو، اپنی خونین لہروں سے سحر کار رنگ بخشا۔ ایک بیوس کن جنگ، جو تخت یا تختہ کے پختہ ارادے سے لڑی گئی۔ انتہائی افراتفری اور بدنظمی کی حالت زار میں لڑی گئی اور اپنے اختتام کو پہنچی۔ چاک و چوبند برطانوی توپ خانوں نے بلوچوں کے کفن بردوش جیالوں کی صفوں پر اپنے آتش فشاں منہ کھول دیئے۔ بلوچوں کی بدبختی سے انہیں شکست کا منہ دیکھنا نصیب ہوا اور حیدرآباد کے قلعے کے بلند و بالا میناروں پر، بلوچوں کے پرچم کی جگہ پر، اُس بدشگون اور ساعتِ بد میں، برطانوی سامراج کا پرچم لہرایا گیا۔[2] اس ہولناک اور خون سے لبریز فتح کے بعد، ہندوستان کے اُس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو (LARD ELLAN BOROUGH) نے ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو، ان الفاظ میں لکھا: "سندھ کی فوج نے ایشیا کے بہادر ترین دشمن کو دو مرتبہ مار کھلائی ہے۔ ایسے حالات میں ان کو یورپ کی بہترین فوجوں کے مقابلے میں اسطرح کی

۱۔ وسطی ایشیا کا مسئلہ "CENTRAL ASIAN QUESTION"
از: ڈیمیٹریئس سی باؤلجر (DEMETRIUS C. BOULGER)
صـ ۱۶۲

۲۔ تاریخ سندھ، از: مرزا قلیچ بیگ، جلد دوئم

یکساں فتح نصیب ہو سکتی تھی . . . . . '' برطانیہ کی ہندوستان کو فتح کرنے کی تاریخ میں
برطانوی فوجوں کو کبھی بھی اتنی سخت اور شدید مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنی کہ ا
میانی کی یادگار لڑائی میں مزاحمت برداشت کرنی پڑی تھی۔ بلوچوں کی بے نظیر بہادری
کا صحیح جائزہ 'سر ولیم نیپئر کے اُس نہایت خوبصورت، دلپذیر اور تفصیلی خاکے سے
لیا جا سکتا ہے: جو اس نے اپنے بھائی سر چارلس نیپئر کے سوانح و وقائع کے ضمن میں تحریر کیا

''پُر سکوت سطحِ میدان کی خاموشی کو بلوچوں کی پُرانے قسم کی توپوں اور ان کی توڑے دار
بندوقوں کی گھن گرج نے چیر کر، قیامت برپا کر رکھی تھی، جن کا جواب کبھی کبھار الائیڈ توپ
دیتا رہتا تھا، مگر وہ اتنی تیزی اور شدت سے ان کا جواب نہیں دے پاتے تھے جتنی
تیزی و تندی اور شدت کے ساتھ وہ اپنے نادیدہ دشمنوں کے گرد، گھیراؤ تنگ کرنے
کے لئے آگے بڑھنے کی خاطر دباؤ ڈالتے تھے، اب کاری ضرب لگانے کے لئے برطانیہ
کی باری تھی، توپوں کو آگے بھگا کر مورچوں پر نصب کر دیا گیا۔ پیدل فوج نے بھاگ کر
فلیلی پر تنگ گھیراؤ کر لیا۔ اور اُس کے ڈھلوان کنارے کے اوپر پہنچنے کے لئے چڑھ دوڑے
بلوچ توڑے دار بندوقیں بھرے ہوئے اُن کے اوپر بلندی پر تاک میں تیار بیٹھے ہوئے
تھے۔ جب حملہ آوروں اور ان کے درمیان، پندرہ گز کا فاصلہ باقی رہ گیا تو انہوں نے بندوقوں
کے دہانے یک لخت کھول دیئے۔ برطانوی فوجوں کی برق رفتاری اور ڈھلوان کی نچلی جانب
نشیب کی بدولت ان کے نشانے خطا ہو گئے اور زیادہ بھاری نشانے خطا ہو گئے اور زیادہ
بھاری جانی نقصان نہیں ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں بائیسویں (رجمنٹ) کنارے کے اوپر
بلندی پر پہنچ چکی تھی اور وہ اس خیال میں خوش تھے کہ وہ اپنے مدِ مقابل، تمام تہس نہس کر دیئے
مگر اپنے سامنے برہنہ تلواروں کو لہراتے ہوئے انسان کے اُگتے ہوئے جنگل کو دیکھ کر انہیں
حیرت و سراسیمگی کے عالم میں پسپائی اختیار کرنی پڑی — بلوچ ان کے سامنے سینہ تان کر
اپنے زرق و برق، اور مختلف رنگوں کے لباس اور پگڑیاں پہنے یوں کھڑے تھے کہ کھڑی فصل

کی مانند گھنے اور رنگا رنگ پھولوں کے کھیت کا سماں بندھ گیا تھا۔ انہوں نے فلیلی کی گہری وسیع تلہٹی کو بھر دیا تھا۔ وہ دونوں کناروں پر جمع تھے اور اس کے سامنے والے میدان پر چھائے ہوئے، وہ اپنے سروں کو اپنی بڑی سیاہ ڈھالوں سے چھپائے ہوئے اپنی تیز تلواروں کو لہرا رہے تھے، جو سورج کی شعاعوں سے چمک رہی تھیں۔ ان کے چیخنے چلانے کی آوازوں میں گھن گرج کی بازگشت تھی۔ وہ مجنونانہ حرکات اور نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھے اور بائیسویں (رجمنٹ) کے ہراول دستوں پر آسیب و عفریت بن کر پوری بے رحمی اور سفاکیت کے ساتھ چڑھ دوڑے ..... اب بلوچوں نے اپنے گنجان ہجوم کے افراد کو باہم قریب قریب کھڑا کر لیا اور پھر چلانے لگے اور بندوقچیوں نے متواتر گولیوں کی بارش کر دی۔ تمام محاذِ جنگ پر پُر ہیبت تیغ زنوں کے غیض و غضب کے ساتھ کود پڑنے اور یلغار کرنے اور ہلّہ بولنے کی آوازیں بخوبی سُنی جا سکتی تھیں اور ان کا احسن طور پر نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایسی لڑائی کا آغاز ہوا جس کی حربی تاریخ میں نہ کوئی نظیر ملتی ہے اور نہ کبھی سنی ہے۔ یہ وحشی جیالے تا ابد ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لئے ایک دوسرے کے دوش بدوش جمع ہو گئے تھے۔ وہ تلوار اور ڈھال آگے کئے ہوئے اپنے حریف کی صفوں میں گھسنے کی خاطر انتہائی بے جگری سے لڑ بھڑ رہے تھے۔ ان بہادر سپوتوں کو نہ تو چھوٹے ہتھیاروں سے گولیوں کی بارش پیچھے ہٹانے پر مجبور کر سکی اور نہ ہی سنگینوں کی تیز نوک اور دائیں جانب ایک ہی جگہ پر مورچوں میں متعین متعدد توپوں کی دھانوں سے چھلانگ مار کر آتے اور بیس بیس کے قریب بیک وقت، گولہ باری سے اُڑتے جاتے اور سینکڑوں کی تعداد میں ان کی لاشیں گہرے نشیب میں لڑھکتی چلی جاتیں۔ لیکن انکی پُر ہجوم صفوں میں واقع خلا، فوری طور پر عقب سے پُر ہو جاتا۔ آگے کی صفوں میں زندہ بچ جانے والے سب بھی والہانہ انداز میں پوری شدت اور نہ تھمنے والے غصّہ کے عالم میں آگے بڑھنے کے لئے مکمل دباؤ ڈالتے تھے۔ اور سنگینوں اور تلواروں کا مستقل اور مکمل ٹکراؤ اور مقابلہ جاری تھا۔

اس طرح انہوں نے اپنی خوفناک جدوجہد کی جنگ لڑی جو زیادہ سے زیادہ تین گز کے رقبے پر محیط تھی اور وہ اکثر باہم خلط ملط ہو جاتے اور کئی مرتبہ مختلف رجمنٹوں کو ان وحشی شمشیر زنوں کے دباؤ اور ان کی طاقت سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا حتیٰ کہ یورپی نژاد لوگوں کو بھی ان کی زبردست یلغار سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ تقریباً تمام یورپی افسر اب مارے جا چکے تھے یا زخمی ہو گئے تھے۔ اور ان سے کئی گنا زیادہ، سیاہ سپاہی کام آ گئے یا زخمی ہو گئے۔ تب پست معیار کے حامل سرخیل اب آہستہ آہستہ پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ مگر ان کا سپہ سالار، جو کہ ایک ماہر شہسوار تھا اور اپنے امتیازی اور مخصوص ساز و سامان کی بنا پر دور ہی سے ممتاز تھا، جس کے سر پر زرہ اور پگڑی دونوں نمایاں تھے، ہمیشہ سخت دباؤ ڈالتا اور اس کے تشجیع میں سیاہ فام تیغ زن پھر میدانِ جنگ میں جم جاتے۔

ساڑھے تین گھنٹے تک اس طوفان نے تھمنے کا نام ہی نہیں لیا۔ اور بلوچ اپنی آبرو اور ننگ و ناموس کی لاج رکھ کر، پر امید ہو کر، اتنی بڑی طاقتور فوج کو پیچھے دھکیلنے کے لئے زور لگاتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تعداد گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔ جب لڑائی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تو سر چارلس نیپئر...... نے اپنی جنگی حکمت عملی بدل دی۔ وہ جانتا تھا کہ بلوچوں کو بالمقابل اور سامنے کے حملوں سے شکست دینا محال ہے۔ سو وہ دائیں جانب، پہلو سے فوجوں کو حرکت میں لایا۔ اس جانب دفاع کمزور تھا اور یہ ناگہانی حملہ کامیاب ثابت ہوا۔ اور بلوچوں کو جو دائیں جانب نرغے میں آ گئے تھے، عقب سے ایک غیر متوقع حملے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ لیکن تب بھی وہ زیادہ جوش و خروش سے لڑ رہے تھے۔

"ایک سپاہی نے آگے کو جھک کر اپنی سنگین کو ایک بلوچ کے سینے میں اتار دی مگر اس تندی اور کرخت جنگجو نے، گرنے کے بجائے، اپنی ڈھال دور پھینک دی اور اپنی بندوق کو بائیں ہاتھ میں تھام کر اپنے جسم کو سنگین پر اس اینٹھن اور کرب کے عالم میں بھی، آگے کی جانب دھکیلا، تاکہ وہ تلوار کے ایک ہی وار سے اپنا انتقام لے سکے۔ کیونکہ بلوچوں کو دوسرا وار کرنے کی

ضرورت نہیں رہتی۔ وہ دونوں اکٹھے گِر کر مر گئے"

بہرحال جنگ میں ان کو شکست ہوگئی اور بلوچ پسپا ہونا شروع ہوگئے۔ لیکن نہ تو وہ منتشر ہوئے اور نہ ہی ان کے چہروں سے خوف کے آثار ہویدا تھے اور بڑے بڑے جتھوں اور مجمع کی صورت میں واپسی اختیار کی۔ بلکہ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے حرکت کرتے تھے۔ اِن کی بڑی بڑی ڈھالیں ان کی پشت پر لٹک رہی تھیں اور دُور عقب کی جانب خشمناک آنکھوں سے مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ فاتح ان کا قریب قریب تعاقب کرتے اور گولیوں کی بوچھاڑ پہ بوچھاڑ کرتے جاتے۔ حتیٰ کہ وہ ان کو قتل کرتے کرتے تھک کر چور ہوگئے۔ مگر ان اولوالعزم دُھن کے پکے جانبازوں نے آرام کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا اُٹھا کر چلنے کی عادت اور چال کو برقرار رکھا اور بھاگنے کی خاطر تیز تیز قدم نہیں اُٹھائے۔ گو کہ موت اب ان کے سر پر سوار تھی"

دو تین ہزار افراد جو رسالے کی زد سے بچ کر انتہائی دائیں جانب مورچہ سنبھالے ہوئے تھے، اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے اور وہ ایک اور یلغار کرنا چاہتے تھے۔ تمام برطانوی توپوں کا رُخ فوراً ان کی جانب پھیر دیا گیا اور ایسی سخت گولہ باری کی گئی کہ وہ بھی نااُمید و مایوس ہو کر دوسروں کے ساتھ چلے گئے۔ میانی کی جنگ ایسے کٹھن حالات میں ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء میں لڑی گئی۔ محاذِ جنگ پر دُوبدُو لڑائیوں اور دست بدست مبارزوں کا ایسا معرکہ گرم تھا جس میں کوئی بھی دوسرے پر رحم نہیں کھاتا تھا، نہ کوئی کسی دوسرے سے مدد کا طلبگار تھا اور نہ ہی کسی کو کسی سے مدد ملنے کی توقع ہوسکتی تھی۔ سپاہی، یورپی اور بلوچ سب ایک جیسے، خون کے پیاسے، سنگدل اور کٹھور واقع ہوئے تھے۔ سر کے بدلے سر قلم کرتے اور خون کے بدلے خون بہاتے تھے، دونوں جانب سفاکیت عروج پر تھی، خون ریزی ہولناک اور شدید تھی اور قتلِ عام کی کوئی انتہا نہ تھی"[1]

۱۔ برطانوی سلطنت کے بارے میں کیمبرج کی تاریخ۔ جلد چہارم صفحہ ۵۳۷ "CAMBRIDGE HISTORY OF THE BRITISH EMPIRE"
از: ایچ ایچ ڈاڈویل (H.H DODWELL)

اے۔ آئی شاند (A.i SHAND) اپنی کتاب، جنرل جیکب کی سوانح عمری میں بلوچوں کی مردانگی، حوصلہ مندی، شجاعت اور استقامت کا صحیح اور پُر تاثیر نقشہ یوں کھینچتا ہے۔ تمام بلوچ خواہ انہوں نے گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگ لڑی یا پیدل، خوفناک مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ سب لوگ قوی و کسرتی بدن اور گٹھے ہوئے اعضاء رکھتے تھے، وہ دھوپ میں اسقدر جلے ہوئے تھے کہ صرف ہڈیوں اور رگوں کے ڈھانچے باقی رہ گئے تھے۔ ان کی تلواریں چوڑی اور چھوٹی تھیں جن کی دھاریں، صلاح الدین کی اُس شمشیر کی مانند تیز اور برّان تھیں، جس سے وہ صلیبی مجاہدوں پر نقاب اُٹھا کر اچانک حملہ آور ہوتا تھا۔ نیپئر کا خیال ہے کہ ان کے عام ناگہانی ہلّوں میں انہیں ماہر و مشتاق تیغ زنوں سے سابقہ پڑا۔ وہ جیسے بھی ہوں مگر انہوں نے کئی شاندار دست بدست لڑائیوں اور دو بدو مبارزوں میں اپنے کو خطرناک حریف ثابت کر دکھایا ہے۔ جب ان کے زخمی زمین پر گر جاتے تو وہ اسقدر خطرناک اور پرجوش ہو جاتے تھے جیسا کہ درویش کے شمشیر زن سوڈان میں ہو جاتے تھے وہ ایک اور ہتھیار کے علاوہ، توڑے دار بندوق اپنے پاس رکھتے تھے جس کا مظاہرہ سر چارلس نیپئر نے چند سالوں کے بعد کیا تھا جو کہ ہماری پُرانی براؤن بِس (BROWN BESS) بندوق سے بدرجہا کمتر معیار کی تھیں..... ان بدوی جنگجوؤں نے اپنے بے قاعدہ ضوابط کے مُطابق فنِ حرب اور جنگی حکمتِ عملی میں طاق و مشاق ہونے کا بخوبی مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کامیاب چھاپے مارے اور گھات میں بیٹھ کر زک پہنچانے میں سبقت و برتری حاصل کی۔ جب تمام حالات اور مواقع ان کے لئے سازگار ہوتے، تو وہ لڑتے، جب مدّ مقابل کی تعداد، ان سے کہیں زیادہ ہوتی تو وہ شرم کئے بغیر بلا تأمل بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن حوصلہ مندی، دلیری اور جرأت مندی کی خصوصیات ان سب میں عمومی طور پر یکساں حالت میں موجود ہوتی تھیں۔ جب وہ زچ ہو کر بے بس ہو جاتے، تو ہتھیار ڈالنے اور سر تسلیم خم کرنے کے بجائے، مردانگی کے ساتھ عزم و استقلال کے

پیکر بن کر بے جگری سے لڑ کر جان دینے کو ترجیح دیتے"۔[1]

پوسٹنس (POSTANS) نے کئی سال سندھ میں گذارے اور بلوچوں کے مختلف طبقوں کے ساتھ استوار اپنے تعلقات اور روابط کے مدِنظر، وہ بڑی روایتی گرم جوشی کے ساتھ اس نسل کے کردار کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے:" بلوچ اس ملک کے آخری فاتحوں کی حیثیت سے غالب جماعت ہیں اور کہستانی خطوں سے مغربی جانب چلے آئے ہیں. وُہ اس خطۂ ارض کے جاگیر دارانہ مالک ہیں. وہ ایک آرام طلب، تند و تیز اور گُستاخ و بے باک نسل ہیں حتیٰ کہ آخری حکمران بادشاہوں کو ان کے خوف و ڈر سے دبک کر بیٹھ جانا پڑا. کیونکہ ہتھیاروں سے مسلح و مرصّع ہو کر وہ اس خطہ کو اپنا ملک سمجھتے تھے. ان کے سردار جو کسی حد تک منتخبہ ہوتے ہیں، اس ملک کے انتظامی معاملات و امور میں لامحدود عمل و دخل کے حامل تھے اور ایک مکمل مطلق العنان فوجی حکومت و آمریت کی تشکیل کرتے تھے..... عام بغاوت برپا کرنے کی اطلاع کو کسی تیز رفتار شتر سوار کے ذریعے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک برق رفتاری سے پہنچایا جاتا ہے اور چند دنوں کے اندر اندر بیس تا تیس ہزار افراد کا لشکر جمع کیا جا سکتا ہے. ان کا ہر آدمی ہر وقت جنگ کے لئے تیار ہوتا ہے. عملی طور پر ان کے کوئی قواعد و ضوابط نہیں ہیں، توانا ترین شخص بہترین سپاہی ہوتا ہے...... بلوچ بہترین اور ماہر نشانہ باز ہیں اور اوائلِ عمر میں ان کو جنگی تربیت دی جاتی ہے مگر وہ تلوار پر انحصار کرتے ہیں. میانی میں وہ اپنی توڑے دار بندوقیں پھینک کر ہماری (برطانوی) فوجوں کی سنگینوں پر چڑھ دوڑے تھے. سر چارلس نیپئر اپنے مراسلات میں رقمطراز ہے: "بہادر بلوچوں نے

---

۱. جنرل جان جیکب، از: اے. آئی شانڈ A.I. SHAND
صفحات ۱۹۷، ۲۰۰

پہلے پہل اپنی توڑے دار بندوقوں اور پستولوں سے گولیاں برساتے ہوئے عزم استقامت کے ساتھ اپنی جانوں پر کھیل کر نہر کے کنارے، جھپٹتے اور امنڈتے ہوئے، بھرپور حملہ کیا۔ لیکن ان جیالے ماہر شمشیر زنوں کو بندوقوں اور سنگینوں کی برتر قوت کے مقابلے میں، نشیب میں جا پڑا۔ کسی بھی مرتبہ اور حیثیت کا شخص اور کوئی بھی بلوچ، اس وقت بارعب تصور ہوتا ہے جب وہ تلوار سے مزین ہو۔ یہ اس کے لباس کا، کلاہ اور پگڑی کی طرح ضروری حصہ ہے۔ بلوچ مہمان نوازی کے آداب کو بخوبی برتتے ہیں اور کسی اجنبی کی خدمت کرنے میں کبھی غافل نہیں ہوتے۔ جب وہ کھانا تناول کر چکا ہو تو خوب روشن آگ کے الاؤ کے گرد چکتی چاندنی میں اس (مہمان) کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں اور اپنی غارت گری اور شکاریانہ زندگی کے کارناموں کے عکاس کرخت نغموں اور وحشیانہ قصے کہانیوں سے اس کا جی بہلاتے ہیں۔ کھلے میدان کے کھیل ان کے محبوب مشاغل ہیں[1]۔

میکوناگھی (MECONAGHEY) اظہار خیال کرتا ہے: "بلوچ بڑے جنگجو ہونے میں بہت مشہور ہیں۔ وہ شکل و شباہت میں دبلے پتلے ہیں۔ عادات و اطوار میں اعتدال پسند ہیں اور ان میں قوت برداشت بلا کی ہے۔ معمولی غذا پر طویل مشقت اور تھکاوٹ سہہ لینے کے عادی ہیں..... حتیٰ کہ حالیہ برسوں میں بھی بلوچ، جنگ و جدل کو اپنا مشغلہ اور کاروبار حیات سمجھتے ہیں اور زراعت اور امن کے کسب و فنون کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں ..... مجموعی طور پر بلوچوں کو آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے اور عام طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ وہ صاف دل و راستباز ہیں۔ اور حقیقت پسندی اور عزت و وقار کی خصوصیات کے لحاظ سے اپنے ہمسایہ افغانوں سے برتر ہیں۔ اپنے سردار کے اطاعت شعار، فرمان بردار

۱۔ سندھ پر ذاتی مشاہدات "PERSONAL OBSERVATINSON ON SIND"
از: پوسٹنس (POSTANS) صفحہ ۴۰-۴۴

اور وفادار ہوتے ہیں، گو کہ دوسروں کے ساتھ ان کے رویئے میں غرور و تکبر آزاد روی خودسری کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ ان کی وفا کیشی، راست گوئی مہمان نوازی اور خواتین کے ساتھ ان کا حُسن سلوک، ان کی اعلیٰ خوبیاں ہیں۔ جب کہ آرام کوشی، غرور و تکبر اور شاید حد سے زیادہ حساس طبعی ان کی خامیاں ہیں۔...... عورتوں اور بچوں کی کبھی بے حرمتی نہ کرنا ان کے جنگی آداب ہیں، درآں حالیکہ خواتین اسوقت بھی سلامتی و تحفظ کے ساتھ نکل کر باہر جا سکتی ہیں جب کہ ان کے مرد افراد اور عزیز و اقارب، لڑائی کر رہے ہوتے ہیں۔ لڑکوں پر اسوقت ہاتھ اُٹھانا جائز تصور ہوتا ہے جب وہ لباسِ بلوغت شلوار کی صورت میں پہن لیتے ہیں[۱]"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یوں لکھا ہے: "بلوچ بنی نوع انسان کی ایک خوبصورت اور متحرک نسل ہیں جن کی جسمانی قوت اتنی زیادہ تو نہیں ہے، لیکن وہ آب و ہوا اور موسمی تبدل و تغیرات کے خوگر ہیں اور ہر نوعیت کی مشقت اور تھکن برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے مویشی بانی اور گلہ بانی کے دور میں ہیں اور لوٹ مار کے معرکوں کے عادی ہیں، جن کے دوران وہ ہر قسم کے تشدد اور مظالم کے اقدامات کو روا جانتے ہیں — وہ مہمان نواز لوگ تصور ہوتے ہیں[۲]" ایک اور معتبر ماخذ یوں رقمطراز ہے: کوچ اور بلوچ وحشی لوگوں کی کچھ نسلیں ہیں جو کرمان کی سرحد پر پہاڑوں میں رہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ حجازی عربوں کی نسل سے ہیں۔ جنگ و جدل خون خرابہ، سرقہ اور رہزنی ان کے مشاغل ہیں۔ اگر کبھی ایسا واقعہ ہوا کہ ان کو اجنبی لوگ نہ مل سکیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جائداد کو

۱: بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیئر سیریز۔ جلد سوئم۔ ضلع سبی ص ۵۱ - ۴۰

۲: انسائیکلوپیڈیا۔ برٹانیکا۔ جلد سوئم۔ نواں ایڈیشن۔ ص ۳۰۳

لوٹتے اور غارت کرتے ہیں۔ اس طرح بھائی، خویش و اقارب اور دوست باہم لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔۔۔ اور وہ اسے ایک اچھا کام تصور کرتے ہیں[1]۔" ایرانیوں اور بلوچوں کے درمیان صدیوں پرانے نسلی، سیاسی اور معاشرتی نفرت اور کشمکش نے، دونوں نسلوں کے درمیان دشمنی کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔ ایرانی کبھی بھی بلوچوں کو عزت و احترام کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے، جنہیں انہوں (ایرانیوں) نے حقارت کرنا ہی سکھایا ہے۔ خونی اور تاریخی تعصبات کے مدِنظر ایرانی اہلِ قلم سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ وہ بلوچوں کے شاندار حصائل کو پیش کریں گے، تاہم مبالغہ آرا، ایرانی ادیبوں میں سے ایک اہلِ قلم کو اخلاقی طور پر مجبور ہو کر حقیقت کا اظہار کرنا ہی پڑا ہے، ازم آرا لکھتا ہے: "بلوچ صادق اور صاف گو ہیں اور مکمل طور پر ایماندار کارکن ہیں۔ اگر کوئی قیمتی شے یا دستاویز ان کی تحویل میں دی جائے، تو وہ کبھی بھی اس میں خیانت نہیں کریں گے اور اس کی حفاظت و نگرانی میں اپنی جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ وہ غیر مہذب ہیں مگر اس حالت میں بھی اطمینان اور افتخار سے سرشار ہیں۔۔۔۔ وہ بہادری اور جنگی جوش و ولولہ میں مشہور ہیں، جیسا کہ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں ان کو پہاڑی بکرے سے تشبیہہ دی ہے، کیونکہ وہ سر سے پیر تک مسلح ہوتے ہیں اور میدانِ کارزار میں کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے۔۔۔۔ بلوچ اپنی خواتین کے ساتھ انصاف و مساوات کا سلوک کرتے ہیں[2]۔"

نسلی جبلات و روایات اور بدویت و قبائلیت کے امتزاج نے بلوچوں میں، وفا شعاری، مہمان نوازی اور سخاوت کی درخشاں خصوصیات کو فروغ دیا ہے جو عالی نژاد بلوچوں کی مشترکہ میراث ہے۔ ڈیمز بیان کرتا ہے: "یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بلوچ تمام

۱: برہانِ قاطع

۲: جغرافیۂ نظامِ ایران از علی ازم آرا۔ باب پنجم ص ۴۳

خوبیوں میں سے سخاوت وفیاضی کو فوقیت دیتے ہیں جب کہ لالچ اور حرص وطمع کو جملہ جرائم میں سے بدترین تصور کرتے ہیں جس کی پاداش میں سنگین ترین سزا دی جاتی ہے[۱]۔" بلوچ کسی شخص کے بزرگ وولی کے مرتبے تک پہنچنے کے لئے سخاوت وفیاضی کے علاوہ دوسرے عوامل وخصائل کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ تقریباً ہر گاؤں کے قبرستان میں کسی بزرگ اور پیر کا مزار ہے جو اپنے زمانۂ حیات میں اور بعد از مرگ بھی اپنی فیاضی کی وجہ سے "سخی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان گزرے ہوئے بزرگوں اور پیروں کے مقبرے مرجع خلائق بن کر زیارت گاہیں بن گئی ہیں اور ان کے قریب پتھروں کے یادگاری ڈھیر دل میں ہر پتھر کا جو اضافہ ہوا ہے وہ اس امر کی دلالت وغمازی کرتا ہے کہ کوئی قول پورا ہوا ہے ایسے شخص کی زیارت گاہیں قبائل میں ہر جگہ موجود ہیں اور ہم مریوں میں "سخی" (فیاض) پہلاگ کرتے ہیں "سخی" "سخی شہری" کا احترام کرتے ہیں۔ گشکوریوں میں سخی گہرام کی عزت وتوقیر کی جاتی ہے، مزاری قبیلے میں سخی رندخان موجود ہے، "سخی صوبیدار" جیکب آباد کے بلیدیوں کی برگزیدہ ہستی ہے۔ پھر سخی تنگو ہے جس کی توصیف وثنا میں بولان کے بلوچ اور ساحل مکران کے کچھی رطب اللسان ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کے رند اپنی سخاوت کے کارناموں کی بنا پر اس قدر مشہور تھے کہ وہ بعد کی نسلوں کے لئے ضرب المثل بن گئی۔ رندوں کا ہر عالی نژاد اور طبقۂ اشرافیہ کا فرد فیاضی اور مہمان نوازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہوتا۔ نودبندغ جو اپنی بے انتہا فیاضی میں مشہور زمانہ ہو گزرا "زرزوال" (سونا لٹانے والا) کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اپنی گھوڑی پر پیسوں سے بھرا ہوا خورجین رکھ کر اس کی تہہ میں سوراخ کرتا اور ڈھاڈر کی گلیوں میں سوار ہو کر اس وقت تک گھومتا

۱۔ بلوچوں کی مقبول عام شاعری۔ "POPULAR POETRY OF BALUCHIOS"
از: ایم ایل ڈیمز (M-L DAMES) ص ۳۸

رہتا، جب تک خورجین خالی نہ ہو جاتا۔ اسطرح وہ لاتعداد یتیموں اور محتاجوں کی روزی کا وسیلہ بنتا جو اس کے پیچھے پیچھے لگے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ امیر چاکر نے ایک پیشہ ور ڈونب اس کے پاس بھیجا اور اسے ہدایت و تلقین کی کہ وہ نوبندغ سے ہر اس شے کا تقاضا کرے جو اس کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ ڈونب نے ایسا ہی کیا۔ حتیٰ کہ نوبندغ نے اس سے اس کی چادر (پشتی) اُدھار مانگی جو ڈونب نے اسے دے دی۔ نوبندغ نے اس کپڑے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ٹکڑے سے خود کو ڈھانپ لیا اور دوسرے سے اپنی بیوی کو اور ڈونب کو اپنے سب کپڑے اور گھر میں جو چیزیں بھی موجود تھیں، بخش دیں، یہاں تک کہ اس کا گھر خالی ہو گیا۔[1]

بلوچستان میں اس زمانے میں دولت و ثروت کا معیار مال مویشی تھے اور جنگ و جدل کا محرک، زیادہ مال مویشی کے حصول کی خواہش ہوتی تھی۔ مویشیوں کے ریوڑ اونٹوں کے گلے، نایاب گھوڑے، غلام اور تلواریں انعام و اکرام میں دینا، پر افتخار رندوں کا عام وطیرہ تھا۔ سخاوت، مہمان نوازی، بہادری، شہسواری اور وفاداری، وہ بنیادی معیار تھے جن سے قبائل کی افضلیت اور فوقیت کو جانچا جاتا تھا۔ نواب خان لغاری (متوفی ۱۸۸۱ء) کے بارے میں عام روایت ہے کہ وہ سخاوت میں اتنا معروف تھا کہ ڈیرہ جات اور بلوچستان کے قرب و جوار کے علاقوں سے لاتعداد لوگ، جن کے ہاں تنگ دستی کا دور دورہ ہوتا تھا، اس کے فیاض ہاتھوں کی جانب رجوع کرتے تھے۔ سینکڑوں آڑے وقتوں میں روزانہ مدد و اعانت کے طلبگار ہو کر اس کے گھر جمع ہوتے تھے۔ سالانہ ایک لاکھ روپے سے زائد مالیت کے گھوڑے اور اونٹ، مفلسوں اور محتاجوں کو بخش دیئے جاتے تھے۔ عید کے تہواروں کے موقع پر روپوں سے بھری ہوئی

۱۔ ملاحظہ ہو۔ پاپولر ہسٹری آف بلوچیز۔

تھیلیوں کا ڈھیر جمع کیا جاتا جو صرف قلاشوں اور محتاجوں پر تقسیم کرنے کے لئے مخصوص ہوتیں۔ خصوصی عملہ مقرر تھا جن کے فرائض یہ تھے کہ وہ مہمانوں کے اخراجات اور حساب کتاب کی نگرانی کریں، اس کام کو منظم کریں اور تقسیم وخیرات کے لئے مخصوص رقم، مویشیوں اور غلوں کا حساب کتاب رکھیں۔ دیگر مشہور اور ہمعصر بلوچ سرداروں نے اسی جوش وجذبہ سے اس کی پیروی کی کوشش کی۔ روجھان میں مزاری قبیلہ کے سردار کے گھر میں مہمانوں کے لئے دو سو بستر بیک وقت تیار پڑے رہتے تھے، لیکن پھر بھی بسا اوقات مہمان خانہ میں اس قدر ہجوم ہوتا کہ مہمانوں کے لئے خیمے نصب کرنے پڑتے۔ اسیطرح دوسرے بلوچ سرداروں کی فیاضی، ان کے وسائل اور عزت ووقار اور حلقۂ اثر کی حدود تک قدرے مختلف ہوتی تھی اور ہر جگہ یہی فضا قائم تھی۔ قبائلی بھی اپنے وسائل کی حد تک فیاضی وفراخدلی میں اپنے سرداروں کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے۔ ہر قبیلہ رواج کے مطابق یا تو فصل کا ایک مخصوص حصہ یا اپنی مزروعہ اراضی کا ایک حصہ مستقل طور پر اپنے سردار کو دے دیتا تاکہ فیاضی وسخاوت کے میدان میں اپنے قبیلے کے وقار وشہرت کو قائم ودائم رکھا جاسکے۔ اے۔ میکوناگھی (MECNAGHEY) بیان کرتا ہے کہ "بلوچوں کے لئے مہمان نوازی ایک مقدس فریضہ ہے اور ان کے مذہب کا جز بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ ایک قبائلی کے گھر کے دروازے، ہر آنے والے کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور ایک دشمن بھی اس کے گھر سے اسوقت تک باہر نہیں جاسکتا جب تک کہ اس کا میزبان، اپنی گنجائش کے مطابق، بہتر سے بہتر شے کے ساتھ اس کی خاطر تواضع نہ کرے"۔[1]

١۔ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر سیریز۔ جلد سوئم۔ سبی ضلع
مولفہ: میجر اے میک کوناگھی ص۲۲

بلوچی ضابطۂ اخلاق میں خون کا انتقام لینا تمام فرائض سے مقدم ہے۔ قبائلی قانون کے مطابق، خون کا بدلہ خون ہے۔ چند معاملات میں خون کا معاوضہ مقررہ شرح کے مطابق ادا کیا جاتا ہے۔ جو ہر قبیلے میں مختلف ہے۔ یہ رواج عربوں میں مروجہ دیت کے مشابہ ہے۔ کسی ایک فرد کا قتل کئی پشتوں اور نسلوں تک خاندانی لڑائیوں اور خانہ جنگی پر منتج ہوا ہے، جو طرفین کی تباہی کا موجب بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ کسی ہمسایہ قبیلہ پر معمولی ہاتھ اُٹھانا بھی، خانہ جنگی اور قتل و خونریزی کو ہوا دیتا تھا جس سے نسلاً نسل تک خون خرابہ، فتنوں، باہمی جنگ و جدل اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہتا۔ بنیادی اور اصلی قبیلے مٹ جاتے مگر ان کی بلاواسطہ شاخیں اور ان کے خاندان باہم اُلجھ کر اس سلسلہ کو جاری رکھتے۔ کوئی بھی بلوچ اتنا قابلِ نفرین تصور نہیں ہوتا جتنا کہ وہ بے ہمت اور بزدل شخص تصور ہوتا ہے جو اپنے خاندان کے ننگ و ناموس اور عزت کا بدلہ چکانے میں ناکام رہا ہو، خواہ وہ اولین مجرم کا بہت ہی دور کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ انتقام گیری کا جذبہ اتنا شدید اور تیز ہوتا کہ اگر کسی خاندان کے سب بالغ مرد افراد مارے جاتے، تو مرنے والے خاندان کی خواتین اپنے بچوں کو، بچپن ہی میں قاتلوں کے نام ازبر کراتی رہتیں تاکہ جب وہ انتقام لینے کے قابل ہو جائیں، تو بدلہ لے لیں۔ قدیم بلوچی نظمیں، اشعار اور گیت انتقام گیری کی ایسی داستانوں اور کہانیوں سے لبریز ہیں، جن سے تصورِ خیال کو وحشت ہوتی ہے۔ بجار جو امیر چاکر کے زمانے میں مرغ رندوں کا ایک سردار تھا، بلیدی قبیلے کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی پسلیوں کو کباب بنا کر کھلے میدان میں پھینکا گیا۔ تاکہ کوؤں اور چیلوں کی خوراک بنیں، اس کے بدلے میں بجار کے عزیزوں نے بلیدیوں کے سردار، ہیبت خان کو پکڑ کر ایک بلند چٹان سے سر کے بل نیچے پھینک دیا اور آتشِ انتقام کو مزید ٹھنڈا کرنے کے لئے، اس کا سر تن سے جدا کر کے، کاسہ سر کو تراش خراش کر پیالہ میں بدل دیا۔ جو بجار کے خاندان

پیالے کے طور پر زیر استعمال رہا۔[1] اس قسم کے کئی مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں، جب انتقام میں مارے گئے دشمن کے خون کے گھونٹ مزے لے لے کر پیے، اس کے دل اور کلیجی کو کباب بنا کر اپنے اہلِ خاندان کو تحفتاً بھیجا۔ باہر، جو عظیم بیورغ کا والد تھا، شہ کٹی اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ شہ کٹی نے اپنی جان کے تحفظ کی خاطر تمام حفاظتی اقدامات اختیار کیے۔ مگر پھر بھی ایک روز بیورغ نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس پر ایسا جھپٹا جیسا کہ کوئی باز، کسی پرندے کا شکار کرتا ہو، اس کے برگزیدہ شانوں سے اس کے سر کو تلوار سے کاٹ کر الگ کر دیا اور اپنے شدید انتقام کی پیاس کو مٹانے کی خاطر، اپنی لمبی مونچھوں کو اس کے گرم گرم رواں خون میں ڈبو کر خون کی چسکیاں لیتا رہا پھر سیدھا چاکر کے پاس چلا گیا اور امرا و زعما کی موجودگی میں، اپنی خون آلود مونچھوں کو تاؤ دے کر اپنی انتقام گیری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بیورغ کے چچازاد بھائی حسن مولانغ کو بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ اس کے بھائی ھارین نے دشمن قبیلے کے ایک سو افراد کو تہہ تیغ کر کے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اسطرح اس نے دس افراد اپنے پرجلال بھائی کے گھوڑے کے بدلے میں، دس افراد اس کی انگلیوں کے انتقام میں اور پچاس

۱۔ بقول استرابو، پلینی اور امیا، وحشی و بربری سائیتھی قبائل نے بھی اسی قسم کی سفاکانہ انتقام گیری کے مظاہرے کیے۔ "زمانۂ جاہلیت" میں غسان قبیلے کے کسی فرد نے، اپنے دشمن کے کان کاٹ لیے اور انہیں اپنے جوتوں پر پیوند کر کے تلوں کے طور پر استعمال کیا۔ ہمعصر شاعر لبید نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا: مخصف بالاذان نوالنا :: ونشرب کرھا منکم فی الحجاج

ترجمہ: "کانوں کو جوتوں کے طور پر استعمال کرنا چاہیے اور کاسۂ سر کو شراب کے پیالہ کے طور پر۔"

افراد عمومی انتقام کے طور پر حساب کر کے اپنے شمشیر برہنہ کے شکار بنائے۔ اتنی کثیر تعداد میں جانیں لینے کے باوجود اس کا غصہ اور جوشِ انتقام ٹھنڈا نہیں ہوا اور اس نے اپنے جذبات انتقام کے اظہار کو یادگار الفاظ کا روپ بخشا، جو ہمیشہ کے لئے بلوچوں کی ایک ہر دلعزیز ضرب المثل بن چکی ہے: "میں سارے جہاں کو تو قتل نہیں کر سکتا مگر امن کسی قیمت پر بھی قائم نہیں ہو سکتا، خواہ میرے دشمن بھاگ کر سمندر پار، مسقط ہی چلے جائیں۔"

دھوکہ بازی اور غداری بلوچوں میں سنگین ترین جرم تصور ہوتا ہے۔ وہ قابل احترام اور اعتبار کے لائق فرد ہوتا ہے جس میں اس کے اعلیٰ خون کے تمام اعلیٰ اوصاف موجود ہیں۔ وہ اسی طرح صادق اور سچا ہے جس طرح شمالی سمت کے ساتھ قطب کے تارے کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ہر آزمائش میں اپنے کو نمک حلال ثابت کرتا ہے اور اپنا خون دیکر اپنی صداقت و سچائی کو ثابت کر دکھاتا ہے۔ عظیم ہیورغ نے جب قندھار کے بادشاہ کی خوبرو بیٹی کو اغوا کیا، تو اس نے اپنے سب سے بڑے دشمن لاشاریوں کے سردار گہرام کے ہاں پناہ لی جس نے اس باوقار جوڑے کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا اور ایک ہفتے تک اس معزز اور ذی وقار میزبان نے عمدہ ترین کھانوں اور غذاؤں سے ان کی خاطر تواضع کی۔ لیکن ہیورغ نے اپنے سارے عرصۂ قیام میں ان پُر ذائقہ اور عُمدہ کھانوں کو نہ چکھ کر، شہزادی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب شہزادی نے اس کی وجہ دریافت کی، تو روایت کے مطابق، اس نے اس کا جواب یہ دیا: "گہرام اور اس کا قبیلہ، امیر چاکر اور رندوں کے بدترین دشمن ہیں۔ اگر آج میں اس کا نمک چکھ لوں تو پھر میں کبھی اس کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکوں گا۔"

قابل توصیف شہرۂ آفاق عربوں کی طرح کسی بلوچ کا یہ فرضِ منصبی ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دے جس نے اس کے ہاں پناہ لی ہو۔ (باہوٹ ہو)

اور جب تک کہ وہ اس کے ہاں قیام پذیر ہو۔ چاکر کے دور کے قابلِ ذکر اور خون خرابہ سے بھرپور واقعات میں سے ایک، رندوں اور لاشاریوں کے درمیان تلّی کے مقام پر لڑی گئی، تاریخی جنگ تھی جو ایک خوبرو اور پاکدامن خاتون کی توہین اور بے عزتی کا نتیجہ تھی، جس نے امیر چاکر کے پاس پناہ لی تھی، اپنے باہوٹ کی عزت و ناموس کی خاطر، صاف گو اور راستباز پرجلال رندوں نے اپنی ہر متاعِ عزیز، ماسوائے ننگ و ناموس کے، اس سانحے کی بھینٹ چڑھادی۔ سترھویں صدی کے آغاز پر ایک بلوچ خاتون سمّی جو اپنے اونٹوں کے گلوں اور مویشیوں کے ریوڑوں کی بنا پر، دولتمند اور باثروت مشہور تھی، بلیدی قبیلے کے پاس رہتی تھی۔ مگر یہ قبائلی شاطر اور ناقابلِ اصلاح چور اور نظری لٹیرے ہونے کی بنا پر بہت بری شہرت کے مالک تھے۔ بلیدیوں کے کچھ چوروں اچکوں نے اس کی زندگی اجیرن بنادی تھی۔ وہ ان سے پریشان اور دل گرفتہ ہو کر اپنی شرم وحیا کے تحفظ کی خاطر، گورگیج قبیلے کے دودا کے پاس پناہ گزین ہوگئی۔ بلیدی ہمیشہ اس کے ریوڑوں اور گلوں کو ہانک کر لے جاتے تھے۔ آخر کار دونوں قبیلوں کو باہم دگر نبرد آزما ہونا پڑا۔ اور ایک معرکے میں دودا مع اپنے بھائی اور کچھ دوسرے ساتھیوں کے کام آیا۔ یہ مخاصمت اور دشمنی طول کھینچ گئی اور دونوں فریقوں کے درمیان یہ وحشیانہ جنگیں اور سفاکانہ معرکہ آرائیاں نصف صدی تک حتیٰ کہ سمّی کی موت کے بعد بھی، اسی جوش و خروش، غیض و غضب اور ہولناکی کے ساتھ جاری رہیں، جیسا کہ روزِ اوّل میں ان کے درمیان پہلا معرکہ کارزار گرم ہوا تھا، دو بلوچ قبیلوں بلفتی اور کلمتی کے درمیان "گرگٹ کی جنگ" پناہ گزین (باہوٹ) کی جان کے تحفظ کے بارے میں، ننگ و ناموس کے اس وحشیانہ نقطۂ نظر کی احسن طور پر عکاسی کرتی ہے کلمتی قبیلے کے کچھ لڑکوں نے کسی میدان میں ایک گرگٹ کو دیکھا اور اسے مارنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگے اور وہ بھاگتی ہوئی قریب ہی بلفتی قبیلے کے سردار،

شاہ حسین کے خیمے میں گھس گئی۔ سردار کی خاتون خانہ، بیرٹی خیمے سے باہر نکلی اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکوں سے مخاطب ہوئی: "بچو۔ اس گرگٹ کو چھوڑ دو، یہ میری امانت ہے۔ میرے ساتھ تم اپنے نام و ننگ کی خاطر اتنی مہربانی کر لو۔" مگر اس کی مداخلت کے باوجود جاہل اور کھلنڈرے لڑکوں نے زبردستی خیمے میں گھس کر لاٹھیوں سے گرگٹ کو مار ڈالا۔ اس نے اپنے خاوند کی آمد پر سارا واقعہ اس کو سنا کر یہ سوگند کھائی: "اگر تم نے گرگٹ کا انتقام نہیں لیا تو میں تمہاری بہن رہوں گی اور تم میرے بھائی۔" اس نے جواب دیا: "اے خاتون! تم ذرا صبر سے کام لو۔ کچھ عرصے تک مجھ سے کچھ مت کہو۔ میں اس گرگٹ کی خاطر اتنا کچھ کروں گا کہ زمین خون سے تر ہو جائے گی۔" ایک تریجی کلمتی کے گھر پر حملہ بول کر ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد، نکل کھڑا ہوا۔ اب چند افراد کے تنازعہ نے دونوں قبیلوں کو ملوث کر دیا۔ دونوں فریقوں کے انتقام کی آگ طویل عرصے تک نہیں بجھ سکی اور آتش جنگ نے دونوں حریف قبیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس قدر نقصان پہنچایا کہ ایک مرتبہ صرف ایک معرکے میں طرفین کے اکیس دس آدمی کام آئے۔ اور ایک دوسرے پر متواتر لشکر کشی اور باہمی غارت گری اس پر مستزاد تھی۔ دو صدیوں تک اس حقیر مگر قبائلی نقطۂ نگاہ سے ذی وقار پناہ گزین کے خون کی یاد کو، دونوں متحارب اور حریف قبیلے، اکے دکے حملوں اور مقابلوں کی صورت میں تازہ کرتے رہے۔

بلوچ بڑی سختی کے ساتھ، اخلاق اور ننگ و ناموس کے کچھ مروجہ قواعد و ضوابط پر عمل پیرا ہوتے ہیں جن کا قبائلیوں کے اعمال و افعال پر بڑا اثر و نفوذ ہوتا ہے۔ کسی مخصوص قبیلے کی حقیقی عظمت، بلند مرتبے اور برتر حیثیت کو جانچنے اور پرکھنے کی یہ کسوٹی ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک ان قواعد و ضوابط پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ تہذیب و شائستگی کے روایتی آداب و ضوابط اور اقدارِ حیات، حسب ذیل ہیں:-

۱. خون کا بدلہ لینا، تمام فرائض منصبی میں فوقیت رکھتا ہے۔ اس خطۂ ارض کے مروجہ قانون کے مطابق، خون کا بدلہ خون ہے۔ کبھی کبھی خون کے بدلے میں مقررہ شرح کے مطابق معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جو کہ ہر قبیلے میں مختلف ہوتا ہے۔

۲. امانت کے تحفظ کی خاطر جان کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا۔

۳. اس شخص کے تحفظ کی خاطر جان کی بازی لگانا جس نے اس کے پاس پناہ لی ــــ (باہوٹ) ہو۔ مگر ایک زانی کو کسی قسم کا تحفظ نہیں دیا جاتا۔

۴. مہمان نواز ہونا اور مہمان کے جان و مال کی حفاظت کرنا۔

۵. کسی لڑائی کے دوران، جہاں انسانی جانوں کا ضیاع ناگزیر ہوتا ہے، کسی عورت کسی نابالغ لڑکے جس نے شلوار نہیں پہنی ہو، کسی ہندو اور کسی کمین فرد کے قتل سے اجتناب برتنا۔ (ہندوؤں کو ہمسایہ یا باہوٹ (پناہ گزین) تصور کیا جاتا ہے)۔

۶. کسی مجرم کے خاندان کی کسی خاتون کی مداخلت پر جرم کو معاف کرنا۔ البتہ زنا کے معاملات اس اصول سے مستثنیٰ ہیں۔

۷. اگر کوئی سید (حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی اولاد) متحارب فریقوں کے درمیان مداخلت کرے، تو جنگ کو بند کرنا۔

۸. زانی کو موت کی سزا دینا۔

۹. جب کوئی شخص کسی بزرگ کے مقبرے میں گھس جائے تو اسوقت تک اس پر ہاتھ نہ اٹھانا جب تک کہ وہ اس احاطے میں موجود ہے۔

فیاض، مہمان نواز، بہادر، قابلِ اعتبار اور اپنے قبیلے اور خاندان کے وفادار بلوچ، پٹھان اور ایرانیوں کی تمام بُری خصلتوں سے پاک اور مبرا ہیں۔ آخر میں ہم ایک سادہ مگر سیاسی نسخے کے ساتھ، جو تینوں نسلوں یعنی پٹھانوں، ایرانیوں اور بلوچوں پر

صادق آتا ہے۔ اس بحث کا خاتمہ کرتے ہیں، تاکہ ان تینوں کو اچھا ہمسایہ بنایا جائے پن
کا پیٹ بھرو، ایرانی کو فاقے میں مبتلا رکھو اور بلوچ سے عزّت واحترام کا برتاؤ کرو، کی
بلوچ کے لئے عزت واحترام ہی اس کی زندگی ہے، اس سے عزت واحترام چھین لو تو
وہ زندگی سے محروم ہو گیا۔ وہ اپنے عزت ووقار کے تحفظ کی خاطر، اپنی ہر متاع بلا تا
قربان کر دے گا۔

باب سوئم

بلوچ اعظم

سولہویں صدی عیسوی نے دنیا کو چند بہترین حکمران، سپہ سالار، شاعر، فلسفی، علامہ اور حکیم عطا کئے۔ بلوچستان میں اس صدی کا آغاز، بلوچی آسمان پر ایک درخشندہ و تابندہ ستارے کے طلوع ہونے سے ہوتا ہے۔ یہ شوخشاں ستارہ میر چاکر کی شخصیت تھا جو اپنے دور کے پردۂ سیمیں کا نمایاں اداکار تھا۔ بلوچوں کی عزت و احترام و تحسین و ستائش کا وہ کس قدر مستحق تھا یا ہے؟ یہی سوال گزشتہ چند برسوں میں موضوعِ بحث و تمحیص رہا ہے۔ کیونکہ جب حقائق کا فقدان ہو یا کمیاب ہوں، تو دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بہر حال بلوچ روایات کے پس منظر میں ان کو ایک اعلیٰ پایہ کے ماہر حرب سپاہی کی حیثیت حاصل ہے، عزّ و شان اور وقار و عظمت صرف قابلِ قدر کارہائے نمایاں سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پُر انوار کے علاوہ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ خامیوں سے پاک و مبرا کوئی انسان اب تک پیدا نہیں ہوا ہے، گل و خار ایک ہی شاخ سے پھوٹتے ہیں، شاذ و نادر ہی کوئی فرد شہرت و امارت کی حماقتوں کے احساس کے پر فسوں خمار سے اپنے آپ کو تباہی و رسوائی کے قعرِ مذلت میں غرقاب ہونے سے بچا جا سکے۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ

کئی لائق و فائق اور ممتاز شخصیتوں اور ابطالِ جلیل کو اپنی بے تدبیری، عاقبت نااندیشی اور بد سلیقگی کی بنا پر ناکامی و نامرادی کا شکار ہونا پڑا اور جو شخص یہ تصور کرتا ہو کہ وہ تن تنہا کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتا ہے، اسے عموماً ناکامی و نامرادی کا مزہ چکھنا پڑتا ہے، کیونکہ دانا و عقلمند ترین لوگ بھی غلطیوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

امیر چاکر کی زندگی کے حالات و کوائف کو سن وماہ و تاریخ کے سیاق و سباق سے ترتیب وار بیان کرنا نہایت مشکل ہے۔ بلوچستان اور بلوچوں کے حالات و کوائف اور وقائع پر کوئی ہمعصر تاریخ موجود نہیں ہے۔ ہمیں صرف ان مقامی روایات اور منظوم داستانوں اور اساطیر پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے جو ہمیں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ بلوچستان میں چاکر کے متعلق چند محدود واقعات کے بارے میں وثوق و ایقان کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ان کے قطعی درست ہونے کے بارے میں کچھ بیان کیا جا سکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے باسی اس قدر باشعور نہیں تھے کہ وہ حقائق و اعداد و شمار کو صفحہ قرطاس پر رقم کرتے اور تحریری طور پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے۔ بلکہ وہ تقریری و زبانی طور پر اس استعداد کے حامل تھے۔ بلوچ لوگوں کا نہ کوئی تحریری ادب تھا اور نہ ہی قوانین تھے۔ ان کی آبادی میں انتشار و اقشار تھا اور ان کی حیثیت ایک قوم سی نہیں تھی۔ اس مبہم اور غیر واضح دور کے واقعات کا رجحان تقریباً تجرباتی اور قیاسی ہے۔ مگر پھر بھی حقائق کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے، با وثوق ذرائع و ماخذ سے معلومات اخذ کرنے پر شدید تجسس، جانفشانی اور تندہی کے ساتھ انتہائی سعی کی گئی ہے۔

پندرہویں صدی کے وسط میں مکران کے خطے میں کولواہ کا علاقہ معزز زندول

کا مرکز اور وادیٔ کیچ ان کا مرجع تھا۔[1] دیگر پرہیبت اور طاقتور قبائل میں سے لاشاری، ہوت اور کورائی وغیرہ رندوں کے ساتھ بمپور، وادیٔ کیچ اور پنجگور میں آباد تھے۔ کولواہ سے آگے سطح مرتفع وسطی بلوچستان یعنی جہلاوان اور سروان، ابھی تک ایک نامعلوم خطہ تھا، جہاں رندوں کے شہسوار نہیں پہنچے تھے۔ رندوں کے خصوصی اور بلوچوں کے عمومی سردار امیر شہیک نے عنفوان شباب میں کئی شادیاں کی تھیں مگر اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آخر کار اس نے ۱۴۵۲ء میں تقریباً پچاس سال کی عمر میں پژ رندوں کے ایک معزز اور عالی نسب خاندان کی ایک خاتون خانزادی کو اپنے عقد نکاح میں لیا۔ روایت کی جاتی ہے کہ اس خاتون نے ہمیشہ اپنے خاوند کی اللہ تعالیٰ کی عبادت گزاری اور خدمت گزاری میں حوصلہ افزائی و دلجوئی اور تاکید

---

(۱) مقامی روایات کے مطابق لفظ "رند" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ لفظ امیر رند سے تعلق رکھتا ہے جو بارہویں صدی میں ایرانی بلوچستان کے سردار امیر جلال خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ امیر جلال کی رحلت کے بعد کئی بلوچ قبائل، جنہوں نے امیر رند کو اپنا سردار تسلیم کیا تھا۔ رند کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ رند قبیلہ تعداد کے لحاظ سے پوری نسل ۱/۲ حصہ تھا اور ایک سو سے زائد قبائل عمومی تقسیم میں رندوں کے زمرے میں آتے تھے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں ہیوگز بلر لکھتا ہے: "یہ رند ہی ہیں جن سے تمام بلوچ قبائل اپنی نسبت ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہمسائے ان کو عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور تمام بلوچی روایات کا محور ان کا بطلِ جلیل چاکر ہے۔" رندوں میں ایک طبقہ پژ رند کے نام سے مشہور ہے۔ پژ کے بلوچی زبان میں لفظی معنی ردی کے گالے کے ہیں اور ادبی معنی سفید اور صاف و شفاف کے ہیں۔ پژ رند اور دیگر رندوں میں فرق اس حقیقت میں مضمر ہے کہ پژ رند امیر جلال خان کی براہِ راست نسل سے ہیں۔ پژ، امیر چاکر کی سیادت و سربراہی میں اصلی رند

کی۔ وہ شیہک کی مکمل پاکیزہ اور نیکیوں سے بھرپور پاک زندگی کی دائمی یادگار کے طور پر زندہ رہیں گی۔ اس نے طویل عمر نہیں پائی اور پچاس سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ جبکہ اس کا عظیم الشان اور جلیل القدر بیٹا اس کی زیر تربیت تھا۔ اس عالی نسب، نجیب الطرفین اور پاکیزہ جوڑے کے ہاں دس سال کے عرصے میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ہمارے بطلِ جلیل ان کی مقدس اور پاک محبت کی پہلی نشانی تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام سہراب رکھا گیا۔ امیر شیہک کے پر افتخار پسماندگان کی تعداد اس طرح صرف چار بچوں تک محدود تھی۔ شادی کے چار سال بعد ۱۴۵۴ء میں نیک ساعت میں کولواہ کے ایک گاؤں آشال میں جو ابھی ویران حالت میں ہے۔ دلوں کو گرمانے اور لبھانے والی تقریبات سعیدہ کے ساتھ ایک فرزندِ ارجمند کی ولادت ہوئی۔ افتخار و انبساط سے سرشار باپ نے اپنے خاندان اور اپنی قوم کی روایات کے تتبع میں ضروری رسومات سرانجام دیں۔ اس نے بلوچی دستور اور عربوں کے قدیم فطرت پرستانہ رسم و رواج کے مطابق[1] ایک تلوار نومولود کے سرہانے رکھ دی اور ناف کو کاٹ کر اپنے معروف تیز رفتار گھوڑے کے کان پر باندھ دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اس کے

آبادی پر مشتمل تھے۔ بعد ازاں ایک ہی تنے سے کئی شاخیں بلاواسطہ نکلیں۔ ادوارِ مابعد میں پُر رندوں کے حصے دیگر قبائل کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح بگٹی قبیلہ کے پیروزانی، غلبانی اور نوحانی شاخیں، کھوسہ قبیلہ کے جلالانی اور جندانی شاخیں، گورچانی قبیلہ کی درکانی شاخ اور لغاری قبیلہ میں عالیانی، رشمانی، ہرکانی، ہیبتانی اور رمضانی شاخیں، سب پُر رند ہیں۔ وڈیکل بجارانی، گشکوری اور غلام بولک قبائل ان کے ماسوا ہیں۔

(۱) آداب المفرد باب الطیر من الجین ص۵۸

بیٹے کو ایک ممتاز تیغ زن اور نامور شہسوار کا اعزاز بخشے۔ اس جلیل القدر بیٹے نے اپنے ایامِ طفولیت میں ہی اپنی خوش آئند اور درخشندہ صلاحیتوں کا مکمل ثبوت فراہم کیا۔ اور اپنے لائق و فائق والد کی خواہشات و توقعات پر پوری طرح پورا اترا نومود کی پیدائش کے چھٹے روز اس کا نام چاکر (خادم) رکھا گیا اور یقیناً اپنے خون اور اپنی نسل کی کما حقہٗ خدمت کر کے وہ اسم با مسمّیٰ ثابت ہوا۔ اس طرح وہ تمام بلوچی داستانوں اور روایات کا ہیرو بنا۔ شاہی طبع والد نے ایک باوقار اور پرشکوہ دعوت کا اہتمام کیا۔ جس نے بلوچی شان و شوکت کے حامل تمام عوامل کو باہم شیر و شکر کر دیا۔ بلوچ امراء و شرفاء کو بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا۔ کشتی، نشانہ بازی اور گھوڑوں کی ڈور کے مقابلوں نے اس عظیم اجتماع کو نہایت محظوظ کیا اور رقص و سرود اور شعر و نغمہ کی محفل نے اس تقریب سعید کو چار چاند لگا دیئے۔ ایسی تقاریب کا اہتمام نیم مہذب معاشرے کی فضول خرچیوں اور اسراف کے اظہار کی احسن طور پر غمازی کرتا ہے۔ عوام الناس اور مختلف طبقوں کے لوگوں نے اپنے مستقبل کے سردار کی ذات، خوشحالی، شان و شوکت، قوت و سطوت اور امن و سلامتی کے لئے دعائے خیر کی۔

چاکر ایک مہذب اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا شجرۂ نسب اس طرح ہے۔ چاکر ابن امیر شیہک ابن امیر اسحاق ابن امیر کالو ابن امیر منان، ابن امیر بیزن ابن امیر بلوچ خان ابن امیر رند ابن امیر جلال خان، مؤخر الذکر نے تقریباً ۱۱۰۰ء تا ۱۱۸۵ء کے درمیان زندگی گزاری اور ایرانی بلوچستان میں بمپور کے مقام پر وفات پائی۔ اس متحرکین ذہن اور ہونہار بچے کے ایام طفولیت کے رجحانات و میلانات کے بارے میں ہمیں کم معلومات حاصل ہیں تاہم اس کی طفولیت اور بچپن سے لے کر اس کے جوان ہوتے تک اس کی

احسن طریقے سے تربیت و پرورش کا اہتمام کیا گیا اور اس کے والد نے ہمیشہ اپنے نابالغ بیٹے کو سیادت و سربراہی کے مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر اس تربیت و پرورش میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ جہاں تک مدرسہ و مکتب میں پڑھنے کا تعلق ہے وہ اس سے محروم رہا۔ ماسوائے اس کے کہ اس کی والدہ نے اسے عرفِ مذہب کی مبادیات سے خود ہی آگاہی بخشی۔ اس نیک سیرت اور پاک فضیلت خاتون نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی نیکوکاری اور پاک طینتی کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہونے کی خوب تربیت کی۔ اپنی نوجوانی کے زمانے میں چاکر کو مہم جوئی اور جنگجوئی کی داستانیں سننے کا بہت شوق و ذوق تھا۔ اور تاریخ کے عظیم سرفروشوں کے قصے کہانیاں نہایت انہماک اور توجہ اور صبر و تحمل سے سنتا تھا۔

کم سنی اور نوعمری کے مردانہ کھیلوں میں تیغ زنی اور نیزہ بازی اس کے محبوب مشاغل تھے اور شمشیر زنی اور شعر و شاعری سے اس کو نہایت لگاؤ اور محبت تھی اور وہ ان کو قدر و منزلت اور عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ تیز اندازی اور نشانہ بازی بلوچوں میں مقبول عام تھی اور نوجوان چاکر اس فن میں انتہائی ماہر اور مشاق تھا۔ وہ جنگجوئی کا شوقین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نسل کا بہترین شہسوار تھا۔ جس طرح وہ جسمانی طور پر ہتھیار بندی، مہم جوئی اور شہسواری میں چاک و چوبند تھا۔ اسی طرح وہ ذہنی طور پر بھی تیز، مستعد، متحرک اور چست و چالاک تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے اپنی شاندار زندگی کے جوہر دکھائے اور اپنے کو ایک عظیم اور اکمل ترین رہنما ثابت کر دکھایا۔ جس کی بنا پر پوری نسل نے اس وقت حالت جنگ اور اجلاس عدالت میں اس سے اپنا بہترین نمائندہ ہونے کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور اس کی عزت و تعظیم کرتے تھے امیر شیہک کی خواہش تھی کہ وہ اپنی حسین حیات میں کچھ مقاصد کی تکمیل کرے۔

وہ اپنے خاندان کے مرتبے اور اس کی حیثیت اور یکجہتی کے مدِ نظر چاہتا تھا کہ وہ نجیب و بہادر پنڑ رندوں کے ساتھ رشتے ناطے ذریعے اتحاد قائم کرے جو اپنی کسی شاخوں کی پر شکوہ عظمت کا امتزاج تھا۔ اور جیسا کہ ہمارے مشاہدے میں آتا ہے انہوں نے ریاست کی کشتی کے طوفانوں میں گھر جانے کے دوران میں بلوچوں کی محدود فرماں روائی اور آزادی کے تحفظ میں اپنے آپ کو بلا شک و شبہ مسلمہ طور پر آہنی لنگر ثابت کیا۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کو اپنے دور اور اپنی نسل کے ایک زبردست شمشیر زن میر باہر خان پنڑ رند کے عقد میں دے دیا۔ جو میر عالی[1] کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس خاتون کے بطن سے گوہر نایاب بیوزغ پیدا ہوا۔ بلوچی داستانوں میں شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ جو زندگی بھر کسی تنقید و نکتہ چینی کی پرواہ کئے بغیر بلا خوف و خطر اور بے عیب و بے داغ ہو کر ہمیشہ میر چاکر کا دستِ راست رہا۔ اور شک و شبہ سے بالاتر ہو کر صدق و یقین کے ساتھ اس کا استقلال اس طرح وفادار و فرماں بردار رہا کہ جس طرح کہ آلہ قطب نما، ہمیشہ اپنا رخ شمال کی جانب کئے ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی کی شادی کے ۱۵ سال بعد، شاہین صفت پیرانہ سال امیر شہک کو اپنے تیس (۳۰) سالہ لختِ جگر چاکر کے لئے ایک مثالی خاتون کی فکر دامن گیر ہوئی اور شفیق والد نے اپنی پسند کے مطابق رندوں میں سے گل محمد کی دختر شہناز کا انتخاب کیا۔ شادی کی تقریبات کا مشرقی شان و شوکت اور تزک احتشام کے ساتھ شایانِ شان طریقے سے بڑے پیمانے پر انتظام و اہتمام کیا گیا۔ بہت سے اعلیٰ مرتبت بلوچ شرفاء و امراء نے شاہی جوڑے کو عمدہ نسل کے گھوڑے، قیمتی

---

(۱) میر عالی نل کی جنگ میں کام آیا۔ اس کے تین فرزند، مشہور و معروف حسن مولانغ، محمد اور اریتھے۔ حسن مولانغ اور محمد لاشاریوں کے ساتھ کسی مقابلے میں مارے گئے۔

زربفت و کمخواب کے کپڑے، اعلیٰ قسم کی قالینیں، سونے اور چاندی کے ظروف منقش زیورات، عمدہ عمدہ نگینے اور کشیدہ کاری کے اعلیٰ نمونے اور بہترین قسم کے ظروف، تحفے اور نذرانے کے طور پر پیش کئے۔ چاکر کے ہاں اس پاکدامن خاتون سے تین بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام میر شہداد، میر اللہ داد اور میر شیخ تھے۔ جنہوں نے بلوچی تاریخ اور داستانوں میں زندگی کے مختلف میدانوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ میر شہداد کسی حد تک اپنے والد کی نظیر تھا اور اپنی شہکاری اور پاکبازی میں مشہور زمانہ تھا۔ اللہ داد نے اپنی شمشیر زنی اور بہادری میں اپنا سکہ منوایا۔ لاڈ پیار سے بگڑا ہوا چڑچڑا شیخ اپنی سطحی لاف زنی پر نازاں اور مغرور تھا۔ اور قنوطی مزاج، مایوسانہ فطرت اور عیاش طبع ہونے کی بناء پر مے و سرود کا دلدادہ و شوقین مزاج ہم مشرب و ہم پیالہ رفقاء کی رنگین محفلوں کا شائق و راغب تھا۔

چاکر، بلوچوں کے سردار کی حیثیت سے۔

۱۴۸۴ء میں اپنے بیٹے کی شادی کے بعد جلد ہی ۸۰ سالہ ضعیف شیخ نے اپنے ضعف اور کمزوری کی بناء پر اس سخت مزاج، پر اضطراب اور پرآشوب نسل کی سرداری کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے فریضے میں اپنے کو مزید قابل نہ سمجھ کر اپنے اس محنتی، ذہین اور لائق بیٹے کو اس اعلیٰ مسند اختیار پر بٹھانے کا عزم صمیم کر لیا۔ اس نے تمام شرفا اور امراء کا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور بلوچی روایت کے مطابق اس کے سر پر سیادت و اقتدار کی پگڑی باندھی جو کہ مقدس رومن سلطنت کے عصائے شاہی کے نشان سے مماثلت رکھتی ہے۔ تمام بلوچ سرداروں نے تعریف اور تحسین کے ساتھ اس کی سیادت کو تسلیم کیا۔

اور اسے اپنی نسل کے سردارِ اعظم کے خطاب سے مخاطب کیا۔ مسندِ سیادت پر بیٹھنے کے فوراً بعد، سردارِ اعظم نے فوری طور پر عظیم مہمات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور فتوحات کی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ سیماب فطرت اور شجاع طبع ہونے کی بنا پر یقیناً ایک جری اور بہادر شخص تھا۔ لیکن اس کا غیر لچکدار ذہن پہلے سے طے شدہ تصورات اور فیصلوں کے تابع تھا۔ وہ، جیسا کہ ہمیں معلوم ہے "عسکری حکمت عملی" کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے تمام زندہ شرفاء کو مجتمع کیا۔ اور ان کے سامنے خاران اور لس بیلہ کے ہمسایہ علاقوں کو فتح کرنے کے بارے میں اپنی شدید خواہش اور جوش و خروش کا اظہار کیا۔ سب نے صبر و تحمل اور فرمانبرداری کے ساتھ اس کی باتوں کو سنا اور اپنے لائق و فائق سردار کی خواہش اور حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور جلد ہی ہزاروں کی تعداد میں جیالوں کا ایک لشکر کثیر اس کے پر افتخار پرچم تلے جمع ہو گیا۔ اپنی خواہش کی تکمیل میں اپنے با صلاحیت جنگجو شہسواروں کی رہنمائی کرتے ہوئے اس نے طوفان بن کر خاران کے سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قبیلے پہ قبیلے اس کی طاقت اور غیض و غضب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے رہے۔ فتح و نصرت کے نشہ سے سرشار ہو کر وہ اپنے مرکز کی طرف لوٹ آیا۔ ابھی تک اس کے جنگجوؤں نے اس مہم کے بعد دم بھی نہیں لیا تھا کہ اس نے لس بیلہ پہ فیصلہ کن حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اور پھر فوراً تلواروں، ڈھالوں اور گھوڑوں کی صفیں آراستہ ہوئیں۔ چند ہی دنوں میں اس نے اپنی فتوحات کے ابواب میں ایک اور سنہری باب میں اضافہ کر کے لس بیلہ کو ایک معمولی مقابلہ کے بعد اپنی مفتوحات میں شامل کر لیا۔ کئی ساحلی قبائل نے، جو لسبیلہ کے ناگہانی سقوط سے سہمے ہوئے تھے اس کی فوجوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس طرح چند ہی ہفتوں میں خاران

اور لسبیلہ کے تمام علاقے اس رند عقاب کے زیر تسلط آگئے۔ چند مہینوں کے آرام کے بعد اب تقدیر کے شکار بلوچوں کی قسمت، جو کہ طویل عرصے کی غیر مہمانی زندگی سے اکتا چکے تھے۔ ایک بہت بڑی تبدیلی کی منتظر تھی۔ اس تغیر کی تحریک میر چاکر کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔ جس نے حقیقتاً اپنے آپ کو بلوچی تاریخ کی عظیم شخصیت ثابت کیا۔

مکران کو الوداع

ہمسایہ خطہ سندھ کی زرخیزی اور سمہ حکمران کے دربار کی شان و شکوہ کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں، ہندوستان کی دولت و ثروت کے افسانوی بیانات، دس سال قبل سہراب خان دودائی[1] کے ساتھ ملتان میں لانگاہ حاکم کے فیاضانہ سطحی مظاہرے اور مکران کی دیرانی و خشک سالی وہ عوامل تھے۔ جو مہم جوئی و حصولِ دولت و تلاش معاش و روزگار کے لئے نئے افق ڈھونڈنے کی خاطر، ایک نیم متمدن نسل کے مضبوط و با استقلال و مستحکم قائد کے غیر معمولی جذبۂ تجسس و ہوس کو ابھارنے کے محرک بنے۔ ایک نیا شوق اور نئی تحریک، اس ٹھوس، سخت اور بے لچک نسل کی تمام جبلتوں اور طاقت کو دعوتِ عمل دے رہی تھی۔ مکران میں چاکر کا من موہنے کے لئے اب کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ درحقیقت اس کی نام آوری اور شہرت کے سورج کا طلوع مکران چھوڑنے کے بعد ہوا۔ اس خطۂ ارض کے بنجرپن اور محدود وسائل اس کے لئے سخت مسائل کا باعث بنے ہوئے تھے۔ خانہ بدوش بلوچ قبائل کے ریوڑوں

---

(۱) ملاحظہ ہو۔ ماثر رحیمی از عبدالباقی النہاوندی۔

اور گلوں کے لئے کافی چراگاہیں نہیں تھیں اور چارہ دستیاب نہیں تھا۔ پوری نسل کو مسلسل اضافۂ آبادی کی بدولت عملاً ایک نازک معاشی بحران کا سامنا تھا۔ عوام الناس غیر مہماتی زندگی سے تنگ آکر امن و امان کی آرام کوشی اور بیکاری سے آہیں بھرتے اور مدتوں کی ذہنی اذیت میں لذت کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا وہ بیکاری سے غیر مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ چاکر نے کیچ میں مختلف قبائل کے سرداروں کو جمع کیا۔ جن میں لاشاری سردار گہرام بن شادین کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ کیونکہ رندوں کے بعد سب سے مضبوط و محکم قبیلہ اس کے ماتحت تھا۔ اس کی رائے لی گئی اور اس نے بخوشی و رغبت حامی بھر لی، دوسرے سرداروں نے یکے بعد دیگرے سردارِ اعظم کے پختہ عزم و ارادے کے سامنے بلا تردد سرِ تسلیم خم کیا۔ بلا کسی توقف، حیل و حجت، شک و شبہہ اور تعطل کے چاکر نے دور دراز کے قبائل میں قاصد روانہ کیے کہ وہ عام ہجرت اور کوچ کے لئے تیاریاں مکمل کر لیں چاکر کے فیصلے نے بلوچوں کی قسمت بدل دی۔ قبیلہ پہ قبیلہ یعنی رند، لاشار، جتوئی بلفتی، مری، بگٹی، حکمتی، رخشانی، کبدانی، موسیانی، سنجرانی، نوحانی[1]، نمردی، سرگانی، سیاہ پاد، کوش[2]، شر، کورائی، بلیدی[3] وغیرہ سیلاب کی طرح امنڈتے

---

(۱) نوحانی قبیلہ قدیم ترین بلوچ قبائل میں سے ایک ہے اور روایت ہے کہ وہ پیغمبر نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس لئے نوحانی کہلاتے ہیں۔

(۲) کوش بھی بلوچوں کے نہایت ہی قدیم ترین قبائل میں سے ہے یہ قبیلہ قدیم کوش یا کوشانیوں سے مناسبت رکھتا ہے۔ جنہوں نے اپنے مقدس اور لادینی تاریخ کے مطابق اپنے ابراہیم اور نوح انسانوی ایرو تھروس (ERATHRUS) کے ذریعے دیگر مشرقی ممالک سمیت پورے عربستان پر حکمرانی کی مگر زیادہ تر دریائے دجلہ و فرات کے ڈیلٹاؤں میں قیام پذیر رہے، کوشانی، کوش (KUSH) یا

ہوئے کیچ میں جمع ہو گئے۔ معزز پژرند اپنے تین پرشکوہ سرداروں میر جاڑو، میر باہر اور میر بجار کی زیر قیادت کلانچ سے روانہ ہوئے اور وقت مقررہ سے پہلے کیچ پہنچے، اس طرح پانچ تا چھ لاکھ کا ایک ناقابل تسخیر جم غفیر، سردار اعظم کے قطعی حکم کا بے تابی سے منتظر تھا۔ دس ہزار راوچی (پیالہ بردار اور غلام جن کی اکثریت جت ہوتی ہے) اپنے قائد قبیل جت کی سرکردگی میں اس لشکر جرار کی تقلید میں کوچ کرنے اور روانگی کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ۱۴۸۵ء میں، بلوچوں کی عادت کے مطابق رات کے پچھلے پہر، سردار اعظم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مکران کو الوداع کہا۔ اور اس خطہ کو تقریباً بغیر کسی حکمران و آقا کے پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دو صدیوں تک مکران متواتر حاکم و آقا بدلتا رہا اور آخر کار اٹھارہویں صدی کے وسط میں وہ ذلت آمیز طور پر ایک غیر اور اجنبی نسل گچکیوں کے رحم و کرم اور ماتحتی میں رہ گیا۔ جن کی پست حکمت عملی نے پر افتخار امارت مکران کی تاریخ کو داغدار بنایا اور زنگ آلود کر کے چھوڑا۔ انہیں اپنے ہولناک دورِ حکومت میں، جسے بجا طور پر مکران

کوش (KOSH) کی اولاد تھے جو پیغمبر نوح علیہ سلام کا پوتا تھا اور کلدانی شہنشاہ نمرود کا پردادا تھا

(۳) بلیدی بلوچوں کے قبائل میں کثیر اور معتدبہ تعداد میں موجود قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے۔ قدیم زمانے میں اس قبیلے کا ایک حصہ شام سے مصر کے شہر قمیص (KEMIS) کی جانب چلا گیا۔ وہاں سے انہوں نے یونان کی جانب ہجرت کی۔ جہاں وہ ڈانائیڈیس (DANAIDES) کہلاتے تھے اور ایڈوریس (ADORES) یا ایڈونیس (ADONIS) کی پرستش کرتے تھے

ملاحظہ ہو۔ (COURY OF GENTILES)

مطبوعہ ۱۶۶۹ء

کا شرمناک اور پر آفت عہد کہا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر ایک ملی جلی اور مخلوط نسل کے زور مایہ لوگوں کا، جنہیں نقیب کہا جاتا ہے، تعاون حاصل رہا۔ جو کہ نیم وحشی تھے اور ان میں حبشی خون کا اختلاط نمایاں تھا اور رنگ اور ذات بالکل متضاد رنگت کے حامل تھے۔

بلوچوں کی ہجرت کی، ہمعصری شعری داستانوں میں سے ایک میں نہایت مؤثر انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ جسے ڈیمز نے جمع کر کے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس کا متن یوں ہے:۔

"معزز رند، خطۂ بمپور، وادیٔ کیچ اور مکران کے باغات میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ڈومبکی تھے۔ جو بلوچ آبادیوں میں سب سے بڑا گھرانہ ہے"

"رند اور لاشاریوں نے باہم عہد و پیمان کیا۔ اور دعوت دی کہ آؤ یہاں سے کوچ کریں اور ان غیر آباد علاقوں کو خیر باد کہیں، ہمیشہ بہنے والی ندیوں اور دریاؤں اور سرسبز زمینوں کی جستجو کریں۔ اور ان کو آپس میں تقسیم کرتے جائیں"

"جب وہ اپنے گھروں میں آئے تو ان سرداروں نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ اصطبل لانبی اور متناسب اور سڈول جسم کی گھوڑیوں کو اصطبلوں سے کھول کر تیار کر لو۔ اور باد جیسی تیز رفتار گھوڑیوں اور نو ہزاری سمندوں پر زینیں کس لو درول اور چراگاہوں سے سڈول اونٹوں کے گلوں کو ہانک لاؤ"

"ان جیالوں نے اپنی محبوب بیویوں سے کہا۔ اپنے ایوانوں سے نیچے اتر آؤ اپنے قالیچوں اور خوبصورت تکیوں کو لپیٹ لو۔ اپنے پیالوں اور مکرانی قدحوں کو لے آؤ۔ کیونکہ اب جا کر مزید یہاں قیام نہیں کرے گا۔ اور دور افتادہ خطوں کی جانب چلا جائے گا۔ فیاض رندوں نے اپنی قبائیں اور پگڑیاں پہن لیں۔ لمبی لمبی سرخ جوتیاں پیروں میں ڈالیں۔ خود، ڈھال، تیر کمان خنجر اور جملہ ہتھیاروں

سے خود کو مزین کیا۔ تب چالیس ہزار شہسواروں نے میر کی آواز پر لبیک کہہ کر گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔"

رندوں کے چالیس ہزار جنگجو شہسوار، اس لشکرِ جرار کے ہراول دستے کے طور پر بڑھ رہے تھے، چالیس ہزار لاشاری اپنی تلواریں سُرخ نیاموں میں ڈالے میمنہ اور میسرہ کے محافظ تھے۔ تیس ہزار میر عالی[1] اپنے سردار میر ہیتاں کی قیادت میں دس ہزار غلاموں کے علاوہ عقب میں اس سیل رواں کے پہرہ دار تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں اونٹ گھوڑے اور خچر ساز و سامان سے لدھے ہوئے تھے اور عورتیں بچے اور بوڑھے ان پر سوار تھے۔ تمام طبقوں اور عمر کے لوگ شریک تھے۔ امیر و غریب کی کوئی قید و تمیز نہیں تھی۔ اس طرح یہ قافلۂ عظیم، عالم مشرق کی شاہی اور مسحور کن زندگی کا چھوٹا مگر حسین پیکر تھا۔ اس کے ساتھ پرجوش اور دلنواز گیت گائے، نغمے الاپے اور ساز بجائے جا رہے تھے۔ حبشی شکل و شباہت کے حامل غلام سُرنا اور ڈھول بجا بجا کر اس پرشکوہ روانگی کی تقریب کی شان و شوکت میں اضافہ کر رہے تھے اور صدائے جرس، اس سفر کو دلنواز تر بنا رہی تھی یہ پورا منظر ایک ایسے پرسطوت اور باطمطراق جلوس کا مظہر تھا۔ جس کی نظیر نئی نوع کی ہجرت اور شورش کی داستانوں میں نہ کبھی احاطہ تحریر میں لائی گئی ہے۔

---

[1] میر عالی، میر جلال خان کا چھوٹا بھائی تھا اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی ایک روز کچھ لاف زنوں نے شیخی بگارتے ہوئے، چند بلیدی معتبرین کی موجودگی میں، اس پر طنز و مزاح کے چند جملے کسے۔ جس سے وہ مشتعل اور ناراض ہو گئے اور جواب دیا کہ آج کے بعد بلیدی اپنے آپ کو میر عالی کی اولاد کہیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ میر عالی یا میر عالی پوتر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

اور نہ سنی گئی ہے۔ لیکن اس سخت جان اور عاقبت نا اندیش نسل کی صفوں میں سیاسی اتحاد، تدبر، انتظامی صلاحیتوں، تنظیم اور سیاسی قوت و اختیار کے حصول میں عزم صمیم کے منقود ہونے کی بناء پر، سندھ اور پنجاب کے میدانوں کی جانب ان کی اس تاریخی پیش قدمی سے ہندوستان کی تاریخ کی راہ متعین کرنے میں اس پر بہت ہی کم اثرات پڑے۔ ان میں اتحاد و تنظیم کا فقدان تھا مگر حرکت موجود تھی۔ چند روز کے سفر کے بعد، بلوچوں کا یہ طاقتور کاروان مشکے کی طرف جانے والی وادی میں داخل ہو گیا۔ وہ اس کوچ کے دوران میں کئی قبائل کو جو ہٹ دھرمی میں ناقابل اصلاح تصور ہوتے تھے۔ راہِ راست پر لائے اور ان کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ مشکے سے وہ خضدار کی جانب بڑھ گئے۔ راستے میں کچھ قبائل کو انہوں نے ان کی نافرمانی اور سرکشی کی سزا دی۔ خضدار میں چند ہفتے آرام کرنے کے بعد لاشاری سردار میر گہرام اپنے قبیلے کے ساتھ سردارِ اعظم کے صلاح مشورے سے درہ مولا کے راستے جھلاوان کے پہاڑی علاقوں میں داخل ہو گیا۔ اور کچھی کے میدانی علاقوں تک چلا گیا۔ کئی روز کے سخت سفر کے بعد وہ گنداوہ اور گاجان پہنچا کچھ دیگر قبائل بلنتی اور کلمتی بھی سردار اعظم کی حکمت عملی اور خواہش کے مطابق اس بڑے درّے کو چھوڑ کر پچھلی جانب سفر کرتے ہوئے لسبیلہ اور ساحلی علاقوں میں پہنچے۔ کیونکہ وہ اپنی نسل کو ملک کے دور افتادہ علاقوں میں گوشے گوشے تک پھیلانا چاہتا تھا۔ خضدار سے روانگی کے سردار اعظم نے اپنے سرفروش رندوں اور باقیماندہ قبائل کے ساتھ قلات کے بالائی کہستانی علاقوں کی جانب پیش قدمی کی۔ خضدار سے لے کر قلات تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کو اپنے زیر تسلط لے آیا۔ راستے میں کئی قبائل نے علیحدہ علیحدہ جزوی طور پر مزاحمت کی۔ مگر بڑی طرح شکست کھائی۔

باوثوق روایات کے مطابق، اس وقت قلات کا حاکم میرواڑی قبیلے کا عومر (۱) تھا۔ جو اس جگہ کا متنازعہ مگر مستقل قابض تھا۔

ہمیں میرواڑیوں کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں جو کہ ایسے لوگ ہیں، جن کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ روایات ہیں اور نہ ادب ہے۔ وہ ایک ایسا معمہ ہیں، جس کو تاریخ حل کرنے سے قاصر ہے۔ یہ شہر ایک بڑی سخت مزاحمت کے بعد، چاکر کی طاقت وقوت کے سامنے زیر ہو گیا۔

اس فاتح کا دوسرا اقدام قلات کے قرب وجوار کے ان قبائل کو زیر کرنا تھا جو سرکشی اور تاخت وتاراج میں رسوائے زمانہ تھے۔ اس نے ان باقیماندہ قبائل کی گوشمالی کرکے ان کو اطاعت گزاری پر مجبور کر دیا اور ان کو شورش پسندی سے راہِ راست پر لے آیا۔ قبیلے پر قبیلے اس کی اطاعت کرتے گئے۔ قلات سے سردارِ اعظم نے چھوٹی سی جماعت روانہ کی تاکہ وہ قلات کے کہستانی خطوں سے آگے کے علاقوں کے جا کر حالات وکوائف جمع کرے۔ اس جماعت کے افراد نے قلات سے کچھی کے میدانی علاقوں تک پھیلے ہوئے موجودہ کہستانی سلسلے کے درمیان سفر کرتے ہوئے، گہری تنگ گھاٹیوں اور دروں کو پھاندتے ہوئے

---

(۱) ملا محمد صدیق کا مسودہ صفحہ ۲۔ براہیوں کے مطابق اصلی براہوئی ان بنیادی قبائل پر مشتمل ہیں جو بالاستواب رائے، اصلی براہوئی خون اور رشتہ رکھنے کی بناء پر مسلمہ ہیں اور دیگر قبائل بیگانہ اور غیر تصور ہوتے ہیں۔ جنہوں نے کئی اسباب وعلل کی بناء پر براہیوں کے ساتھ الحاق کیا ہے۔ بنیادی براہوی قبیلے احمدزئی، ایلتازئی، میرواڑی، قمبراڑی، گرگناڑی سالاڑی اور قلندراڑی تھے۔

اس علاقے کا بچشم خود جائزہ لیا اور جوہان، نرمک، رودبار، اور بریری کے راستے درہ بولان میں داخل ہو گئے۔ دریائے بولان کی تلہٹیوں میں سفر اختیار کرتے ہوئے وہ ڈھاڈر پہنچے اور اس کی زرخیز زمینوں کو دیکھا۔ پھر وہ سیدھے سیوی (سبی) چلے گئے جو کہ اس وقت ایک دفاعی فصیل میں گھرا ہوا تھا۔ جس پر آسمان سے باتیں کرنے والے دفاعی مینار تھے۔ سیوی کی دلکشیوں اور خوبصورتیوں نے ان کے دل موہ لئے۔ وہ پھر فوراً سرعت کے ساتھ اسی راستے پر سفر کرتے ہوئے سیدھے قلات چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی پوری تفصیلات اپنے سردار کو بتا دیں۔ وہ سبی کے بارے میں ان کی تمام باتیں غور و خوض کے ساتھ سنتا رہا جو جلد ہی اس کے کمال و زوال اور تباہی کا مرکز بننے والا تھا۔ جب موسم سرما کا زمانہ شروع ہوا اور جسم کو ٹھٹھرانے والی یخ بستہ ہوائیں چلنی شروع ہو گئیں تو رندوں کے لئے بھی مرکزی کہستانی علاقوں کی خون منجمد کرنے والی سردی کو سہنا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ مزید برآں سردارِ اعظم نے اپنے کارناموں میں مزید اضافہ کرنے کی خاطر سیوی اور کچھی کے میدانوں کی جانب کوچ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اسی سال کے موسم زمستان میں بلوچوں کے جم غفیر نے بالاستثنائے چند قبائل کے اپنے خیمے اکھاڑے اور گھوڑوں کو تیار کیا۔ زرشانی، سنجرانی، سیاہ پاد اور کبدانی قلات میں رہ گئے۔ مگر مختصر قیام کے بعد خاران، نوشکی اور چاغی کی جانب چلے گئے۔ سردارِ اعظم اپنے قافلے کے ساتھ سطح مرتفع قلات کے ارد گرد پھیلے ہوئے پیچ در پیچ کھردرے اور سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان واقع ناہموار سخت راستوں پر اور وسیع وادیوں میں سے آہستہ آہستہ قدم بقدم سفر کرتا ہوا درۂ بولان میں داخل ہو گیا اور اس نے منزل بہ منزل پیش قدمی کرتے ہوئے آخر کار ڈھاڈر میں آکر اپنا پرچم گاڑ دیا۔ یہ شہر

کبھی دار المقام نہیں رہا ہے۔ مگر یہ اپنی پوری تاریخ میں اس خطے کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ڈھاڈر سے سردارِ اعظم نے اپنا ڈیرہ سیوی منتقل کیا اور تمام روز جنگجوؤں اور جیالوں نے اس کی تقلید کی۔ چاکر کے چچازاد بھائی میران نے ڈھاڈر میں ہی قیام کیا اور اپنی سرداریت قائم کر لی۔ میر جالیوں رہلیدیوں نے درۂ ہرنائی کے دھانے پر اپنے سردار میر ہیبتانی کی سرکردگی میں موجودہ گوشہر اور بھرڑو کے گاؤں میں اپنے خیمے نصب کئے۔ میر باہر اور اس کے مشہور زمانہ بیٹے میر بیوزنع اعظم نے، پڑ زندوں کے ایک حصے کے ساتھ ڈھاڈر اور متھڑی کے درمیان دریائے ناڑی کے مغربی کنارے پر پڑاؤ کیا۔ میر بجار پٹر نے تلی کے پہاڑوں کے قریب سیوی کے مشرق میں سکونت اختیار کی۔ نوحانیوں نے اپنے سردار عوثر کی قیادت میں درہ تلی کے قریب قیام کیا جو کہ گاجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ صوفی منشی اور درویش صفت کھیریوں کی اکثریت نے کورزین اور چیلیجی کے میدانوں کی جانب کوچ کیا۔ مگر ان کا سربراہ شہ مبارک کچھ زند خاندانوں کے ساتھ شوزان میں ہی رہ گیا۔ کورائی قبیلہ بھاگ منتقل ہو گیا اور کھوسوں نے جنوب کی جانب اپنے ڈیرے ڈالے اور جدید روجھان اور ماچھی پور کے قریب کئی بستیاں بسائیں۔ اس طرح بلوچ حملہ آور اور مہاجر اپنی محدود آبادی کے باوجود انتہائی ہمت وجرأت اور تیزی کے ساتھ اس خطے کے تمام میدانوں اور سطح مرتفع میں سیلاب کی طرح چھا کر پھیل گئے اور اپنے ریوڑوں اور گلوں سمیت اپنے شجاعانہ عہد سے اس ملک کو بعد ازاں بلوچستان کے نام سے مشہور و معروف کر کے روشناس کرایا۔

سموں سے روابط اور سبی کا سقوط:۔

سلطان محمود بن تغلق (۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱ عیسوی) کے دورِ حکومت میں سموں نے سندھ کے مسلمانوں کی کمک سے سومرہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ کیا اور سندھ کے زیرِ تسلط چلا گیا۔ سمہ قبیلے کے دو خاندانوں نے ۷۵۲ ہجری سے لے کر ۹۲۷ ہجری تک تقریباً ایک سو پچھتر سال سندھ پر حکمرانی کی۔ سمہ خاندان کی حکومت کا بانی جام انڑ[1] تھا۔ جس نے ساڑھے تین سال تک حکمرانی کی اور اس کا آخری حکمران جام کرن ابنِ جام تماچی تھا۔ جس نے صرف ڈیڑھ روز تک حکومت کی۔ سمہ خاندان کے اکثر حکمران کم و بیش، تخت دہلی کے ماتحت تھے۔ دوسرے خاندان کا بانی جام فتح خان تھا۔ عدمِ اطمینان افراتفری اور امن و امان کی شکستہ صورتحال کے دوران، جو سلطنت دہلی پر ۸۰۱ ہجری بمطابق ۱۳۹۸ عیسوی میں امیر تیمور گرگان کے حملہ کا باعث بنی۔ لاڑ کے سمہ جاموں کے دل میں آزاد ہونے کا خیال پیدا ہوا آخرکار جب امیر تیمور کے پوتے مرزا محمد نے غزنی سے پیش قدمی کی اور دریائے سندھ سے گزر کر ملتان اور اوچ پر قبضہ کیا۔ تو اس وقت جام فتح خان نے اس افراتفری اور ہنگامہ خیزی کے دوران میں ملتان کے صوبہ بکھر سے لے کر شمالاً گنداواہ تک، جس کا سبی بھی ایک ضلع تھا۔ پورے صوبہ سیوستان سمیت اپنا

---

(۱) فرشتہ (جلد دوئم صفحہ ۳۱۷) نول کشور ایڈیشن میں پہلے حکمران کا نام جام افرآ لکھا ہے اور یہ صریحاً غلط ہے۔ اس کا نام انڑ تھا (ملاحظہ ہو۔ ابن بطوطہ اور تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف۔

قبضہ جمانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس دوران میں بکھر کے بلوچوں نے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ مگر اس نے جلد ہی ان پر قابو پاکر ان کو مطیع بنا لیا۔ سنہ دو آزاد ہو گیا اور جام فتح خان، بلا شرکت غیرے، اس پورا حاکم بن بیٹھا۔

سموں کی اصل نسل ابھی تک تاریخ کے لئے ایک معمہ ہے، کئی مورخین نے ان کی اصل نسل نسب کے بارے میں من گھڑت اور مبالغہ آمیز تصورات و خیالات پیش کئے ہیں۔ لیکن کسی کو بھی غبار آلود ماضی سے پردہ اٹھانے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ چند سندھی مورخین کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی النسل ہیں، اور بعد کے فارسی وقائع نگاروں اور مورخوں نے ان کے لقب جام کی نسبت سے ان کے حسب نسب کو ایران کے بادشاہ جمشید(۱) سے ملایا ہے۔ مگر دونوں نظریات شک و شبہہ سے مبرا نہیں ہیں۔ مغربی مورخین ان کو راجپوت نسل سے تصور کرتے ہیں۔(۲) اور یہ خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر معصوم کا خیال ہے کہ وہ کچھ سے آئے ہیں(۳) چچ نامہ کا مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ سمہ قبیلہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے حملے سے قبل سندھ میں رہتا تھا۔(۴) اور انہوں نے عرب سپہ سالار کا خندہ پیشانی

---

(۱) ملاحظہ ہو۔ تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری از ابوالفضل

(۲) تاریخ ہندوستان از ایلیٹ جلد اول صفحہ ۴۹۶۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲۵ صفحہ ۱۲۳ گیارہواں ایڈیشن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

(۳) معصومی از ایلیٹ، صفحہ ۲۲۳۔

(۴) جامع التواریخ کے مصنف کے مطابق عربوں نے سندھ پر ۹۳ ہجری بمطابق ۷۱۴-۱۵ عیسوی میں حملہ کیا۔ ریورٹی یہ سن ۹۲ ہجری بمطابق ۷۱۰-۱۱ عیسوی بتلاتا ہے۔ اصل سن ۹۳ ہجری بمطابق ۷۱۲ عیسوی ہے۔ ملاحظہ ہو یعقوبی جلد دوم صفحہ ۳۴۶

کے ساتھ خبر مقدم کیا اور حملہ آور نے ایک عرب سربرآوردہ ممتاز شخصیت کو سمہ قبیلہ کا سردار مقرر کیا۔[۱] تاریخ طاہری کے مطابق کچھ کے راجے سمہ قبیلے سے ہیں۔[۲]

جام نظام الدین عرف تندہ ۸۶۶ھ ہجری (۱۴۶۱-۶۲ء عیسوی) میں سندھ کے تخت شاہی پہ براجمان ہوا۔ اس کے زیر تسلط علاقے، سندھ کے علاوہ دریائے بولان کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی پوری قلمرو کو نظم و نسق کے لحاظ سے مستحکم رکھا اور اس کا دور حکومت طویل عرصے پر محیط اور خوشحال دور تھا۔ وہ ان سمہ حکمرانوں میں سے تھا جنہوں نے امن و امان کے فنون کو جنگ و جدل کے مشاغل سے زیادہ فوقیت دی۔ اس کی وفات کے بعد، سمہ خاندان اپنی شہرت و عظمت کے اوج کمال سے محروم ہو گیا اور ان کے حکمران بہ سرعت رو بہ زوال ہوتے گئے۔ وہ میر چاکر رند کا ہمعصر تھا اور عظمت میں اس کی ہمسری کرتا تھا۔ اس وقت رند جنگجو جبالیوں سے، جن کی طاقت کا کوئی مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ سبی میں جام تندہ کی سیادت و حاکمیت کو خطرہ لاحق ہوا۔ جو کہ سمہ فوجوں کے ایک دستے کے زیر تحفظ تھا۔ حریف قوموں کے درمیان لشکر کشی اور محاذ آرائی سے قبل چھوٹی چھوٹی اور معمولی نوعیت کی اشتعال انگیز کارروائیاں ناگزیر ہوتی ہیں۔ اور تخت و تاج کے دو متجسس و ہمسر حریفوں کے درمیان کبھی اعتماد کی فضا بحال نہیں رہتی، سفارتی ہمدردیوں اور محبت کے تمام حیلوں اور بہانوں اور حکمت عملی کے بھیس میں شک و شبہ، خوف و ہراس اور فریب و دھوکہ بازی

---

(۱) چچ نامہ (ایلیٹ) صہ ۱۹۱

(۲) طاہری (ایلیٹ) صہ ۲۶۸

کے سائے منڈلاتے رہتے ہیں۔ تاریخ کے دیگر ہیروؤں اور قائدین کی طرح چاکر دفاعی تدبیروں سے کبھی بھی مطمئن نہیں رہا۔ اور اس کا فرمانروائی کا شوق و ذوق اس امر کا متقاضی تھا کہ دشمن کے وار سے پہلے، وہ کاری ضرب لگانے میں پہل کرے اس نے سبی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا جو ہر طرف سے رندوں کے گھیراؤ میں تھا اور وہ واحد لوگ تھے جن کے سامنے جام نندہ ایک بزدل ثابت ہوا۔ اس کے لوگوں نے جام نندہ کی کہتر افواج کو ہراساں کرنا شروع کیا جو کہ پہلے ہی سے سبی کے قلعے میں جمع ہو کر ایک گونہ محاصرے کی حالت میں بے دست و پا تھے۔ چاکر کی طاقت نے جام نندہ کو جھکنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ اس کے پاس نہ اتنی فوج تھی اور نہ عزم و استقلال تھا کہ وہ اس بلوچ بطل جلیل کے غیض و غضب کا مقابلہ کر سکے۔ وہ اس وحشت خیز یلغار کی مزاحمت کرنے میں نہ تو ذہنی طور پر تیار تھا اور نہ ہی اس میں اتنا حوصلہ تھا۔ اس نے مایوسی اور خوف و ہراس کے عالم میں اس شہر کو سردار اعظم کے حوالے کر دیا۔(۱) یہ واقعہ ۱۴۸۶ء کا ہے۔ اسی سال کچھ مہینے قبل، اسی جام نندہ نے شاہ بیگ اور محمد بیگ ارغون کی افواج کا مقابلہ کیا تھا جو سبی کا قصد کیے ہوئے تھیں۔ جام نندہ نے اپنی افواج دریا خان کے، جو کہ مبارک خان کے نام سے بھی مشہور ہے،

---

(۱) اس ضمن میں چاکر خود اپنی ایک نظم میں اس خیال یوں اظہار کرتا ہے۔

"کچھ عرصے کے لئے میں نے اور جام نندہ نے ایک دوسرے کی مخالفت کی۔ لیکن جام نندہ نے ایک بڑے معرکے سے اجتناب کرتے ہوئے، سیوی کو امیر چاکر کے سپرد کر دیا۔"

زیر کمان بھیجا۔ جن کی بی بی نانی کے قریب جلوگیر کے مقام پر ان سے مڈبھیڑ ہوئی ارغون فوجیں بڑی بے جگری سے لڑیں۔ مگر شکست ان کا مقدر تھی۔ اس کا نتیجہ مغل افواج کے عبرتناک شکست کی صورت میں ظاہر ہوا اور ان کا قائد، میدان کارزار میں مارا گیا۔

میر چاکر کو سبی حوالہ کرنے کے بعد، جام نندہ نے خفیہ طور پر سبی کو شاہ بیگ ارغون کو بخش دیا تاکہ وہ بلوچ فرمانروا کے لئے مصیبتیں کھڑی کرے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سبی کا قلعہ ۱۴۸۸ء میں شاہ بیگ ابن شاہ شجاع الدین زنون کو سندھ کے جام نظام الدین نے بطور جاگیر کے دے دیا تھا[1]

اس نسل کا زوال اور باہمی تقسیم و انتشار۔ رند و لاشار کی خانہ جنگیاں

سردار اعظم میر چاکر بلا کسی نقصان اور بغیر کسی تباہی کے سبی کا واحد مالک بن گیا تھا۔ جام نندہ نے پھر کبھی سبی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر دوبارہ غلبہ حاصل کرنے کے لئے نظر بد نہیں ڈالی۔ لیکن بدقسمتی سے چاکر کی عظمت اور شہرت کو لمحہ بھر کے لئے استقلال کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ انحطاط اور باہمی کشمکش و کدورت اس نسل کی سیاسی بساط کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں! اس کو سبی کے تخت پر اپنی قوت اور شان و شکوہ کے مظاہرے کا بہت مختصر موقع نصیب ہوا۔ بلوچوں کے سنہری دور کے طلوع ہونے پر، ناخوشگوار حالات کی گھنگھور گھٹائیں آسمان پر چھانے لگیں۔ بلوچوں کی قائم کردہ اس قلمرو پر فرمانروائی اور اس

---

[1] ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری از ابوالفضل

کی سطوت و دبدبہ کا طلسم ابتدائی ایام ہی میں ٹوٹ گیا۔ امرأ و شرفا کے دلوں میں رشک و حسد اور سازشوں نے جنم لینا شروع کیا۔ بلوچی معاشرتی زندگی کی پرانی اور مخصوص خامیاں، ان کی انفرادیت پسندی، قبائلیت اور مجنونانہ جنگ کے موثر عوامل اور اثرات بد کے ساتھ اس وقت دوبارہ عود کر آئیں۔ جب دونوں خطرناک اور ہیبتناک قبائل رندوں اور لاشاریوں میں سبی اور گنداوہ کی زرخیز اراضیات پر تسلط حاصل کرنے کے بعد تحفظ و اعتماد کا احساس پیدا ہوا۔ ابتدا میں رندوں اور لاشاریوں میں برابری، ہم پلہ اور ہمسر ہونے کا معیار، ان کی عظمت اور بہادرانہ کارناموں کا باعث بنا۔ مگر جلد ہی اس مساوات و ہمسری کے جذبہ نے وقتاً فوقتاً باہمی کشمکش اور ہنگامہ خیزی کی صورت اختیار کر لی۔ دو پرحسد اور طاقتور ہمسایوں کے درمیان تنازعہ اور خانگی کشمکش کی وجوہات و علل کا کبھی بھی فقدان نہیں ہوتا ہے۔ چاکر اپنے کسی ہمسر اور ہم مرتبہ شخصیت کو برداشت کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اور گہرام کسی کی برتری کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ان میں سے کسی کا بھی دامن، فاش و صریح غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ گہرام آہستہ آہستہ مگر تیزی کے ساتھ بحیثیت طاقت ور بنتا جا رہا تھا۔ جو اسی عزم کے مالک چاکر کے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کے اثر و نفوذ کے افق پر دو سورجوں کی قطعاً گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ چاکر کا مطمع نظر تھا کہ سب کچھ کا وہ مالک بن بیٹھے یا کچھ بھی باقی نہ رہے۔ لاشاریوں کی کثیر نفری اور گہرام کے ولولہ انگیز کردار سے چاکر کو عظیم خطرہ کی بو محسوس ہوئی اور خوف کا عنصر عموماً نفرت کا محرک ہوتا ہے۔ دو افراد کبھی بھی رویوں میں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ حد سے زیادہ بغض و کینہ لازماً انتہائی تلخی پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں آتش صفت، سیماب فطرت اور اولوالعزم ہستیوں کے ناقابل حل اور فتنہ پرداز سخت اختلافات کی بدولت

دو عشروں تک کشت و خون اور تباہی و بربادی نے خوب رنگ دکھایا۔ قبائلی کشمکش تفوق و امتیاز کی خصوصیات کے ادراک اور اس کے ہلاکت خیز نتائج اور اثرات سے بے خبری کے عالم میں، پر افتخار زندہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی جماعت کا محور و مرکز بن گئے تھے اور لاشاری دوسری کا۔ امیر شیہک اور اس کے بیٹے اور جانشین امیر چاکر نے اپنے وقار و قوت کی عمارت، رند سرفروشوں کی بہادری و جگجوئی پر تعمیر کی تھی۔ رندوں کے علاوہ دوسرے قبائل کو بلوچی قلمرو کے سیاسی معاملات پر کوئی اختیار و اثر و نفوذ حاصل نہیں تھا۔ لاشاری رندوں کے اثر و نفوذ اور قیادت کو وقتی حالات کے تقاضوں کے پیش نظر کبھی تسلیم کرتے تھے اور کبھی روگردانی کرتے تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بلوچ لوگوں میں رند اور لاشار قبائل کی جداگانہ حیثیت کی بنا پر عمل پذیر انتشار و اختلافات، بلوچوں کی سب سے بڑی بدقسمتی کا باعث تھے اور بلوچستان میں بلوچی امارت کے زوال اور انحطاط کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوئے۔ سبی، ڈھاڈر اور کچھی کا پورا علاقہ ان عمومی معمولی معاملات اور اختلافات کے پیدا ہونے پر، جو کہ قبائلی زندگی اور تنظیم کے معمولات ہیں۔ میدان کارزار میں تبدیل ہوگیا لاشاری سردار کھلم کھلا میر چاکر کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا اور اس سے نفرت کا برملا اظہار کرنے لگا۔ یہ دونوں مسلمہ اور قوم کے دو بنی دشمن و حریف، طاقت اور قبائلی افتخار کے نشے سے سرشار پچیس سال تک باہم برسرپیکار رہے۔ ان کی مجنونانہ جنگوں نے پوری نسل کو کشت و خون کے مست سمندر میں ڈبو دیا۔ اور بلوچوں کے اقتدار اعلیٰ کی بنیادیں محکم ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہوگئیں۔ دونوں قبائل نے خانگی طور پر جنم لینے والی اپنی قبائلی نفرت کی آگ کو صلح و آشتی کے ذریعے بجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ رند و لاشار سماج کی بہترین اور معزز ترین شخصیات اور ہستیاں ان قبائلی لڑائیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ بلوچ زعماء

میں سے کسی کو اس نفرت و عناد کی دیوار کو ڈھانے اور دونوں قبائل کی طویل خانہ جنگی
کو ختم کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے پر حملے اور مچاپچا بالآخر
دو بڑی قابل ذکر جنگوں پر منتج ہوتے۔ جن میں آخری جنگ نے بلوچ نسل پر منہ زوال
ثبت کر دی۔ سبی اور اس کے گرد و نواح میں رند و لاشار کی جنگوں نے ریاست
کی بنیادیں منہدم کر دیں اور بلوچوں کی برتری اور فرماں روائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
دفن کر دیا۔

کچھ لاشاریوں نے امیر چاکر کے اونٹوں کو چرا لیا اور روایت کے مطابق یہ سانحہ
پہلی بڑی لڑائی کی بنیادی وجہ تھی جو غالباً ۱۴۸۸ء میں لڑی گئی۔ دونوں قبائل کے
درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ سردار اعظم نے چالیس ہزار رند جیالوں کو بشمول
میر عالیوں کے جمع کیا۔ متحارب افواج موجودہ مٹھڑی کے گاؤں سے چار میل دور
مغربی جانب ایک دوسرے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ لاشاریوں کا لشکر تیس ہزار
افراد پر مشتمل تھا۔ لیکن رند اس تعداد کے مقابلے میں شجاعت و بہادری کے اعتبار سے
برتری و سبقت کے حامل تھے۔ صبح سویرے حریف دستوں نے خاموشی کے ساتھ
ہمت و حوصلے سے سرشار ہو کر اپنے مورچے سنبھال لئے۔ لڑائی کی تیاریوں میں
شور و غل اور آوازوں نے آسمان پر اٹھایا ہوا تھا۔ ڈھول دمامے بجائے گئے اور
ان سازوں کی دھنوں پر لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ دونوں متحارب افواج، ہلاکت خیز
لڑائی پر سرپیکار ہو گئیں اور حریف سرفروشوں نے دیوؤں کی سی شیطانی قوت کے
ساتھ اپنے گھوڑوں کی برق رفتاری کے ساتھ ایڑ لگا کر ایک دوسرے کی صفوں پر
ہلہ بول دیا۔ تلواروں اور ڈھالوں کے ٹکراؤ اور تیروں کی سنسناہٹ نے تباہی و
بربادی کا ہولناک منظر پیش کیا۔ تلواروں کی جنگ کا ایسا مظاہرہ کیا گیا جس کی
نظیر، مصائب اور گناہوں کی پست و رذیل دنیا میں کبھی بھی مشاہدے میں نہیں

آئی ہے۔ ہولناک کشت و خون کا بازار گرم کیا گیا۔ تب سورج غروب ہونے لگا۔ لاشاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے، رندوں کی شہور زمانہ شجاعت و بہادری رنگ لائی اور ان کو لاشاریوں کے انتہائی جوش و خروش اور مجنونانہ انتہا پسندی اور اکھڑ پن کے مقابلے میں فتح و نصرت نصیب ہوئی۔ انہوں نے گو کہ حیرت انگیز بہادری اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔ مگر میدان کارزار میں ان کو شکست ہوگئی۔ لاشاری خوف و سراسیمگی کے عالم میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خوف و ہراس، حواس باختگی اور انتشار کا ایک ناقابل تصور منظر نظر آتا تھا۔ اس لڑائی میں بلیدی قبیلہ کی کوش شاخ کے لوگوں نے بہادری کے اعلیٰ مظاہرے کئے اور اپنی بے جگری سے لڑنے کے جوہر دکھائے اور چاکر نے ان کوشیوں کو اس کے صلے میں کچھ اراضیات اور دریائے ناڑی کے کالے پانی کا تیسرا حصہ بطور انعام بخش دیا جو آج تک ان کے قبضہ و تصرف میں ہے۔(۱)

نلی کی جنگ

۱۴۸۰ء تا ۱۵۰۰ء کے دوران کم از کم بیس سال تک معمولی معمولی اور غیر اہم مختلف وجوہات کی بناء پر ان دونوں قبائل کے درمیان قسمت کی ستم ظریفی سے جنگ و جدل ہوتی رہی۔ جس میں قسمت کبھی کسی کا ساتھ دیتی اور کبھی دوسرے کا پلڑا بھاری رہتا۔ ان معرکوں میں سے ایک معرکہ میں جو ریخ کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ عظیم ہیوزع شدید زخمی ہو گیا اور اس لڑائی سے رند نہایت برافروختہ اور مشتعل ہوگئے۔ سردار اعظم کا ایک عزیز میر ریحان اور گہرام کا بیٹا رامین بھی ین

(۱) کوش اب بھی تعمیل کے نحیک قبیلے کا ایک حصہ ہیں۔

ایک موچی کی بیوی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ جس کے حسن و جمال کا گھر گھر چرچا تھا۔ وہ اپنی خوبصورتی، خوش پوشی، لطافت اور نازک اندامی کی بنا پر میر ریحان اور رامین کے درمیان وجہ نزاع بن گئی۔ ان دونوں دوستوں نے اس عشق و محبت کے مسئلے کا باہمی فیصلہ کر کے یہ حل نکالا کہ وہ اپنے مشہور گھوڑوں پر سوار ہو کر شہسواری کا مقابلہ کریں گے۔ دوڑ کی بازی میں جو جیت جائے گا، یہ متنازعہ حسینہ "قتال انعام" کے طور پر اسی کی ہو گی۔ رندوں میں سے دو افراد مصنف مقرر کیے گئے۔ دونوں گھوڑے دوڑ میں برابر برابر نکلے۔ مگر دونوں مصنفوں نے جیت کا فیصلہ ریحان کے حق میں دیا۔ رامین نے اسے اپنی محبت اور برق رفتار سمند کے حق میں ناانصافی تصور کر کے غصے کے عالم میں واپس گنداوہ کی راہ لی۔ اس نے کچھ لاشاری قبائلیوں کو حکم دیا کہ وہ مہیری[1] قبیلے کی حسن و جمال کی پیکر مشہور و معروف نازنین خاتون گوہر کے اونٹوں کے گلوں کو نقصان پہنچائیں اور ان کو چرا لیں۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور ریوڑوں، گلوں اور اونٹوں کی مالکہ ہونے کی بنا پر بہت دولتمند، مالدار اور باثروت خاتون تھی۔ یہ مہ جبیں خاتون عالم شباب میں تھی اور عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی گزارتی تھی۔ اس کے خیمے کی لکڑیاں سونے کی ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے تنازعے معمولی باتوں سے جنم لیتے ہیں اور گوہر کی داستان نے بلوچوں کی تاریخ کا رُخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اپنی الہڑ جوانی اور خوبصورتی کے عالم میں ایرانی

---

(۱) عربوں میں بھی اس نام کا ایک قبیلہ المہری موجود ہے۔ ابن صناح مہری عمرو بن العاص کا، جو پیغمبر صلعم کا ساتھی اور صحابی تھا، ایک دوست تھا۔ ملاحظہ ہو "سیر صحابہ" مہاجرین جلد دوئم صفحہ ۱۵۰ از شاہ معین الدین ندوی۔

بلوچستان سے ترک مکانی کر کے گنداوہ آگئی تھی اور گاجان کے قریب ہی آباد ہو گئی تھی۔ وہ وہاں کچھ عرصہ کے لئے مقیم رہی۔ مگر بعد ازاں لاشاری کبھی کبھی اس کی بےعزتی کرتے اور اس کے گلوں کی لوٹ مار کرتے۔ جس سے تنگ آکر وہ آخر کار سبی منتقل ہو گئی اور سردار اعظم کے سایۂ عاطفت اور زیر تحفظ رہنے لگی۔ اس کا مال و دولت اور اس کا حسن و جمال رندوں اور لاشاریوں کے درمیان وجہ نزاع بن گیا۔ لاشاریوں نے اسی طرح اس کے اونٹوں کے گلوں پر بلہ بول دیا اور اس کے ایک کوہان والے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے اور کچھ کو زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ چاکر کو اس ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس نے تمام رند اشرافیہ کا ایک جلسہ منعقد کیا اور ان شرفاء کی رائے لی۔ کسی نے بھی اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی صورتحال کی نزاکت کا احساس کیا۔ ان کی اکثریت خوش و خروش اور وفور جذبات میں سنگین انتقام پر امادہ تھی۔ سب نے متفق ہو کر اور جنگ کر کے کشت و خون کی ہولی کھیلنے کا عہد و پیمان باندھا۔ عظیم بیوزغ ایک معمولی سے مقصد کے لئے اس قدر شدید ردِ عمل اور ہولناک احکامات پر بڑا متحیر ہوا۔ اس نے معقول دلائل و براہین کی روشنی میں، اس متوقع طوفان بلاخیز کو روکنے کے لئے قائل کرنے کی بڑی سعی کی۔ مگر کسی نے اس کے صلاح مشورے کو وقعت نہیں دی۔ خداوند عزوجل جن کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ تو پہلے ان کو پاگل پن اور جنون کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے، تنگ نظر ریحان، جس کا کردار حرص و آز، بغض و کینہ اور سفاکیت کا مجموعہ تھا۔ جنگ پر اصرار کرتا رہا اور وہ دوسروں کے ساتھ اس آتش سوزاں کو ہوا دے کر بھڑکانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس میں وہ سب جل کر تباہ ہو گئے نوحانیوں کے سردار عومر نے جو آزاد خیالی اور وسیع النظری میں مشہور و معروف تھا جنگ نہ کرنے کی بہت تاکید کی۔ لیکن چاکر نے بلا غور و فکر کے اپنے شرفاء و امراء

کے غلط مشورے کو تسلیم کر لیا اور ایک انتہائی پُر خطر، نازک، جرأت مندانہ، پُر آشوب اور فیصلہ کن انقلابی معرکے کو ہر قیمت میں سر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جس کی نظیر بلوچی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہر قسم کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ عومر اپنے ایک ہزار تجربہ کار جنگبازوں کے ساتھ مل گیا۔ پندرہ ہزار رند سرفروش جنگی لباس زیب تن کئے خوش مزاج شکاریوں کے جھتوں کی طرح اپنے برق رفتار تازی گھوڑوں کے ساتھ جمع ہو گئے۔ ان کے گھوڑوں کے نعلوں تلے زمین لرزتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بیس ہزار شیر دل لاشاری ہر قسم کے مہلک جنگی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر درہ نل کے پاس جمع ہو گئے اور زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے جنگ کے میدان اور مقام کا اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرنے میں فائدہ اٹھایا اور لاشاریوں کے سردار نے اپنے دستوں کو درہ کے بالائی حصوں پر جنگی نقطہ نگاہ سے اہم اور بہترین مورچوں پہ تعینات کر کے گھات میں بٹھا دیا میدان کارزار کی طرف جنگ کے لئے روانگی سے تھوڑی دیر پہلے عظیم بیوزع نے سردارِ اعظم سے صحیح اور معقول دلائل کے ساتھ درخواست کر کے اس کے گھوڑے کی باگوں کو پکڑ کر اسے سخت تنبیہہ کرتے ہوتے کہا: "چاکر اپنی تلوار کو نیام میں ڈالو۔ نوحانی ہزاروں جنگجو جیالوں پہ مشتمل ہیں اور سرخ نیاموں والے لاشاری طاقتور جری اور بہترین جنگجو ہیں۔ انہیں ہمارے ناقابلِ تسخیر قلعے پر حملہ کرنے دو۔ تمہارے لئے پیچھے ہٹنا ناممکنات میں سے ہوگا۔ اور آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا ہے" کچھ ضدی تیس مار خانوں اور لاف زنوں نے اپنی زبانیں کھولیں اور بیوزع سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوئے: "بچوں کی طرح دودھ پینے والا بیوزع، تیروں کی ہیبت سے لرزہ براندام ہے۔ وہ چمکنے والی ہندی تلواروں اور مصری دھات کے ہتھیاروں سے خوف زدہ اور سہما ہوا ہے۔ اسے ریج کی لڑائی کے زخم یاد آتے ہیں۔ اے بیوزع!

ڈرو نہیں۔ جب ہم دشمن کے خلاف اپنی برہنہ تلواریں لہرائیں گے تو ہم تمہیں دشمن کے تیروں کی زد سے بہت دور ہٹا دیں گے۔" بیوزع نے طعن آمیز کلمات سن کر شدید غصے کے عالم میں گھوڑے کی باگیں چھوڑ دیں اور چاکر کو انتباہ کیا کہ اسے آج ہی کے روز اپنے آج کے کئے ہوئے پر پچھتانا پڑے گا۔ ہتھیاروں سے مسلح و مسجع اور جنگ کے دیوتا کی مانند چمکتا دمکتا میرہان نے جو رندوں کا کماندار، سپہ سالار اور مثالی شخصیت تھا۔ اپنی افواج کی قیادت کرتے ہوئے یک لخت، دکھٹے ہی بھرپور ہلہ بول دیا۔ پہلی ہی یورش میں لاشاریوں نے تیروں کی بارش کر دی اور فوراً ان کے شہسوار سرفروشوں نے اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ، رندوں کے ہراول دستوں پر ہیبت ناک اور پر ہول یلغار کر دی اور رندوں کے شہسواروں اور گھوڑوں کا صفایا کر کے ان کی کمر توڑ دی۔ اس جنگ کا سپہ سالار میرہان کام آیا اور عظیم بیوزع کو کاری ضرب آئے۔ جن کی بنا پر لڑائی لڑنے سے معذور ہو کر لڑائی کے دوران نزدیک پہاڑی غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ جو آج بھی "بیوزع کے غار" کے نام سے مشہور ہے۔ امیر چاکر کے بھائی سہراب نے، جو جوش و ولولہ اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ایک بطلِ جلیل تھا۔ شجاعت و بہادری کے جوہر دکھاتے مگر وہ بھی مارا گیا۔ وحشت و بربریت اور جنگی جنون سے پاگل ہو کر دونوں حریفوں کی افواج ہزاروں کی تعداد میں باہم گتھم گتھا ہو کر دست بدست لڑائی میں ایک دوسرے کا بے تحاشا خون بہاتی رہیں حتیٰ کہ کوئی بھی ان تھکے ماندے اور خون سے شرابور مدِ مقابلوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میدانِ کارزار میں ایک ایسا طوفان مچا ہوا تھا کہ لڑائی کا حتمی فیصلہ ہوئے بغیر لڑائی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ موت کا فرشتہ اپنی پوری بربریت کے ساتھ انسانی روحوں کو قبض کرنے میں سرگرم عمل تھا، تلواریں، نیزے اور ڈھالیں انسانی خون سے سُرخ ہو چکی تھیں۔ دست بدست لڑائی بدستور جاری

تھی۔ سر کے بدلے سر قلم ہو رہے تھے، وار کے بدلے وار ہو رہے تھے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا رہا تھا۔ طاقت کے مدِ مقابل طاقت تھی اور غیض و غضب اور قوت و بے جگری کے مقابلے میں غیض و غضب اور قوت و بے جگری کارفرما تھی۔ فوجوں کو ایک کرب ناک اور ہولناک منظر کا سامنا تھا۔ طرف دہشت میں چیخ و پکار، درد و تکلیف کی آہ و بکا کی صدائیں، ڈھول کی جنگی موسیقی کی آوازوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس جنگ میں لڑائی کی ہیبت اور شور و غل، حریفوں کے وحشیانہ انداز میں آپس میں ٹکرانے کا غوغا و فغاں، زخمیوں کی دلدوز کراہیں اور جاں بہ لب زخمیوں کی آہ و بکا ایک ایسے جانکاہ اور عبرت ناک منظر کی عکاس تھیں۔ جس کی نظیر اس دنیا میں کم ہے۔ لاشاریوں کی طرف سے تیروں کی مسلسل بارش، رند جنگجوؤں کی تباہی و بربادی میں ایک بے رحم برقِ تپاں کی مانند، آگ برسا رہی تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں سمند و شہوار تیروں سے گرتے جا رہے تھے۔ اور تلواریں اور ڈھالیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں شجاع رندوں نے مافوق البشری بہادری کا مظاہرہ کیا۔ غصہ، غیض و غضب اور مایوسی و ناامیدی کے عالم میں، انتہائی بے جگری، جوانمردی اور ہمت و حوصلے سے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ لیکن جنگوں کی قسمت کا فیصلہ ایک دوسری نادیدہ طاقت کے ہاتھوں میں ہے۔ تلواروں، نیزوں اور تیروں کی بارش نے ان کی صفوں کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ بلوچی رزمیہ داستانوں میں کسی جنگ کی آگ اس قدر تیز اور ہولناک نہیں تھی۔ دوپہر ڈھلنے تک جنگ کا توازن تاہم برابر رہا متحارب افواج کو توقع تھی اب ایک مزید سخت اور جانکاہ مقابلے کے بعد قسمت کسی نہ کسی کا ساتھ دے کر اس کو فتح و نصرت سے ہم آغوش کر دیگی مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس روز کی فتح و نصرت کا پرچم کسے نصیب ہوگا

ہتھیاروں کی لڑائی بہم جاری تھی اور سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے رندوں نے اپنی صفوں کو پھر مجتمع کیا اور نئے عزم و ولولہ کے ساتھ آگے بڑھے۔ مگر ان کی طاقت و قوت، حکمت عملی، وسائل اور خود اعتمادی میں سے کسی کو بھی کامیابی و کامرانی نصیب نہیں ہو سکی۔ اور نوشتۂ تقدیر کو تسلیم کرنا ہی پڑا جس میں اب کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ لاشار اب اپنے پیہم حملوں سخت جدوجہد اور برق رفتاری کی بدولت زیادہ مستعد اور حاوی ثابت ہوئے چاکر کی مشہور و معروف گھوڑی موسومہ "سوگات" گھائل ہو گئی اور افراتفری کے عالم میں سردار اعظم میدانِ کارزار کے ایک گوشے میں آتش فشاں غصے اور پرنم آنکھوں کے ساتھ خاموش اور ساکت بت بنا کھڑا تھا۔ تدبر، دور اندیشی، مایوسی اور تھکن کے باعث اسے اپنے دارالمقام کی جانب لوٹنا پڑا۔ نوذ بندغ اس کے قریب آیا اور اسے اپنی تیز رفتار گھوڑی موسومہ "پھل" پیش کی اور اس طرح اس نے اسے ہولناک میدان جنگ سے صحیح و سلامت نکل جانے میں مدد کی۔ وہ شکست خوردہ، گھائل اور جنگ و جدل سے نڈھال فوجوں کے ساتھ غم و اندوہ کی حالت میں سبی پہنچا۔ اس پر یہ احساس طاری تھا کہ وہ تقدیر کے مست و شوریدہ سمندر کی طوفانی لہروں میں تنکوں کی مانند بہہ گیا ہے۔ جس پر قابو پانا اور اختیار رکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ آفتاب جہانگیر کے غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد رند جانبازرات کی تاریکی کے پردے میں تھکاوٹ سے چور نڈھال حالت میں اپنے ثابت قدم اور پر عزم اعدار کے قتل عام سے خون آلود شمشیروں اور ہاتھوں کے ساتھ میدانِ کارزار سے پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ وہ آخری دم تک ڈٹے رہے، مگر ذلت آمیز شکست کے قدم روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کسی ایک دن میں اتنی بڑی جنگ اتنی شدت و بربریت کے ساتھ نہ تو کبھی لڑی گئی ہے اور نہ ہی

اتنی خوبصورتی سے ہاری گئی ہے۔ تل کا پورا میدان انسانی خون سے لالہ زار ہو گیا تھا قدرت نے دونوں فریقوں کے جیالے جانباز سپاہیوں کی اس قدر بڑی تعداد میں خون بہایا اور ان کی ہڈیوں کو باقی چھوڑا۔ تاکہ وہ ان کی بدبختی اور بداعمالیوں کی یادگار پر عظیم نقصان اور خرابیٔ بسیار کے بعد لاشاریوں کو فتح و نصرت اور کامرانی کا پرشکوہ پرچم سر بلند کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ لاشاریوں نے عالی نصب رند اشرافیہ کے افراد کے علاوہ ہزاروں لوگوں کا، اس خونخوار میدانِ جنگ میں قتل عام کرکے اپنی بہادری اور سفاکیت کا عظیم مظاہرہ کرکے اپنا لوہا منوالیا۔

گہرام اور لاشاریوں نے چاکر کو اپنی عظمت اور شہرت کو چار چاند لگانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ مگر نل کی ذلت آمیز شکست نے اس کے خوابوں کا طلسم توڑ کر اسے پشیمانی کا سامان مہیا کر دیا۔ اس کی شخصیت، شہرت اور وقار کو بڑا دھچکا لگا۔ اسے زیادہ شہرت و عظمت کے حصول کے بجائے رسوا کن شکست کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ وقت نے، جس میں سب کچھ ہڑپ کر لینے کا مادہ مضمر ہے، اسے ناکامی و نامرادی سے ہمکنار کرکے اس کے افتخار، طاقت اور قوت کو داغ داغ کر دیا۔ اس کی تمام امیدوں اور امنگوں پر غیر متوقع شکست اور تباہی نے آناً فاناً پانی پھیر دیا۔ اسے اپنی متکبرانہ خواہشات کا صلہ یوں ملا کہ وہ اپنے بھائی سہراب کو کھو بیٹھا۔ اپنے نامور و معروف چچازاد بھائی جری میرہان کے عین عالم شباب میں فراق کا غم سہنا پڑا۔ اور اپنے ہزاروں دیگر جیالوں اور جنگجوؤں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس نے بام عروج پر پہنچ کر، اپنی سابقہ ہر دلعزیزی کے نقوش کو پامال کر دیا۔ نل کی شکست نے بلوچ سلطانیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اور رندوں کو اپنی نسل کے اعلیٰ ذہنوں اور بہترین ہستیوں سے محروم کر دیا۔ بدبختی اور زبوں حالی کی خبروں کو جیسے پر لگ جاتے ہیں۔ چاکر تک یہ اطلاع پہنچائی گئی

کہ عظیم بیوزغ بھی میرہان کے ساتھ مارا گیا ہے۔ اس کی موت کی جانکاہ خبروں نے اس کے فولادی اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ غم واندوہ سے گویا اس کا سینہ شق ہو گیا تھا۔ دو روز اس نے غم واندوہ کی حالت جانکاہ میں گزارے اور کسی سے بھی کسی قسم کی گفتگو نہیں کی۔ جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ تیسرے روز عام دستور ورواج کے مطابق اس نے جنگ میں مارے گئے لوگوں کے غم میں "آسروخ" (عام ماتم۔ سوگ) کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اچانک ایک شخص غیر متوقع طور پر اس کے پاس یہ مژدہ لے کر آیا کہ اس نے سبی سے چند میل دور بیوزغ کو شہر کی جانب آتے ہوئے دیکھا ہے۔ استعجاب اور مسرت کے عالم میں اس ماتمی تہوار کو روک دیا گیا۔ اس دوران بیوزغ سبی پہنچ گیا اور چاکر سے ملا۔ اس نے وفورِ جذبات اور انتہائی محبت سے مغلوب ہو کر اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا اور اس کی پیشانی کو والہانہ انداز میں بوسے دیئے۔ چاکر نے ماتمی تہوار منانے کا خیال ترک کر دیا۔ روایت ہے کہ اس موقع پر اس نے یہ کلمات ادا کیے: "اگر بیوزغ زندہ ہے، تو اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں خواہ تمام رند میدان جنگ میں کام آجاتے"۔ غلطی کرنے کے بعد ہر شخص کے ہوش ٹھکانے آتے ہیں۔ آخری برسوں میں، جب چاکر پر ضعف طاری ہو گیا اور اختیار واقتدار بھی حاصل ہوا، تو وہ نل کی جنگ لڑنے پر بڑا نادم اور پشیمان رہا اور رندوں کی تباہی وبربادی کے عظیم نقصان کو کبھی دل سے فراموش نہ کر سکا۔ وہ زندگی بھر میرہان کے غم میں نوحہ کناں رہا۔ نل کی جنگ آخری غلطی تھی جو چاکر سے سرزد ہوئی تھی اور جس کا خمیازہ اسے بڑا سخت بھگتنا پڑا۔

نل کی جنگ میں خون آشام تیغوں کی تیز دھاروں کی آفات کے بعد، رند اور لاشاری قبائل کے کینہ پرور آتش نوا شعرا نے اپنے بغض وعناد اور ہمہ گیر

انتقام کی آگ میں ایک دوسرے کے خلاف، زہر ہلاہل سے لبریز اشعار و نغمات گا گا کر ایک دوسرے کو طنز و تشنیع، طعنہ و نکتہ چینی، مزاح، تمسخر اور "اشغان" کا نشانہ بنا کر نفرت کے جذبات کی جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کردار ادا کیا۔ بیبرچاکر اور گہرام کے درمیان تلخی کو تیز تر کرنے کا باعث بنا۔ جنہوں نے اشعار اور منظومات میں ایک دوسرے کے خلاف اپنے دلوں میں گھر کرنے والے بغض و کینہ اور عناد و نفرت کے اظہار کے لیے، ایک دوسرے سے انتقام لینے کی خاطر، شدید طنز اور طعنوں سے بھرپور اشعار کے ذریعے، ایک دوسرے سے خطاب کیا۔ ہم یہاں ڈیمز کی نقل کردہ نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

میر چاکر ابن شیہک، رندوں کا یادگشت گیت گاتا ہے، رندوں اور لاشاریوں کے معرکے کے بارے میں نغمہ الاپتا ہے۔ وہ گہرام کے جواب میں گاتا ہے۔

"اے گہرام! تم دشمنی لے کر نقصان جھیل رہے ہو۔ بلوچوں میں پھوٹ ڈال کر تم نے فضا کو گرد آلود اور مکدر بنا دیا ہے۔ تم نے نل کی فتح کی رٹ لگائی ہوئی ہے گو کہ تمہاری شہرت کا راز نودبندغ کی عظمت میں مضمر ہے۔ تمہیں خوش قسمتی سے ایک جنگ میں فتح و نصرت نصیب ہوئی ہے۔ اور جیالے رند شہسواروں کی اصیل گھوڑیوں کو مارنے کا موقع نصیب ہوا۔ جن کے نقوش پا ابھی تک نل کی وادیوں پر ثبت ہیں۔ لیکن تم اس روز کے انتقام لینے کی یاد کو فراموش مت کرو، جب نودبسک کے بیٹے میگی اور حسن اکٹھے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ آدم اور مشہور زمانہ نودبندغ، احمد اور سلطان صفت کلو کھیت رہے۔ اور تم اس روز گھمسان کی لڑائی کے دوران گورخروں کی مانند دم دبا کر بھاگ گئے۔ جب رندوں کے تیر تم جیسے بھگوڑوں کی پیٹھ اور کولہوں پر پیوست ہوتے تھے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے داب کے قلعے سے بھاگتے ہوئے درہ مُولہ کے دہانے پر جا کر سانس لیا تھا؟ مگر میں نے پھر بھی تمہارا تمسخر اور مذاق

نہیں اڑایا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا میراثی مغنی تمہارے پاس بھیجا تھا کہ وہ طنز و طعنوں کے نشتروں سے بھرپور اشعار تمہاری محفل میں سنا کر تمہیں شرمسار کرے۔ تم میرے شیر جیسے آہنی پنجوں کی زد سے، خوف زدہ گھوڑی کی طرح، مجھ سے خوف و دہشت کے مارے اپنے سر کو ملک کے گوشے گوشے میں چھپائے پھرتے ہو۔ یاد رکھو! تمہارے لوگوں کا آدھا حصہ میری دہشت سے گاج سے گجرات تک پہنچ چکا ہے۔ اور باقی آدھا حصہ بھلیپور (بہاولپور) میں پہنچ چکا ہے۔ تم زندوں کو سلام کرنے آتے ہو، تم سر پہ سفید چادر اوڑھے غلے کی خیرات مانگنے آتے ہو۔ ان ذلت آمیز کاموں سے تمہاری زندگی تو نامردوں کے لئے بھی باعث شرم ہے اور تم سر پہ پانی کے برتن دھوتے ہو، اب تم عمر کے تحفظ میں اپنے سر کی پناہ مانگتے ہو۔ ذرا صبر سے کام لو، میں تم پہ مردوں کی طرح حملہ کر کے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ چلاؤں گا۔ ہم برق رفتار اصیل گھوڑیوں کے مالک رند ہیں۔ ہم کبھی تم سے مات کھاتے ہیں تو کبھی تم پر ضرور حاوی ہو جائیں گے۔ ہم دونوں جانب سے تم پر یلغار کریں گے اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس سے اپنا حصہ لے کر رہیں گے۔ اے لاف زن گہرام! کان کھول کر سن لو! ان علاقوں کو چھوڑ کر کہیں دور بہت دور بھاگ چلو، شاید وہاں تمہاری قسمت تمہاری یاوری کرے۔ میں تمہیں لٹو کی طرح چکر میں ڈالوں گا۔ اور بالآخر میں اپنے قول کے مطابق ایک طوفان بپا کر دوں گا۔ اور اپنے رفقاء کے دلوں سے تمام خوف نکال کر دم لوں گا۔ تب انتقام کی آگ دھیمی ہو گی۔

گہرام کا چاکر کو جواب الجواب :۔

"اے میری محفل کے بہادر دوستو اور بھائیو! میرے قبیلے کے برگزیدہ اور معتبر مردو آؤ! لاشاریوں کے خان اور سردار جمع ہو جاؤ! آؤ تاکہ ہم مجلس

مشاورت کا انعقاد کریں۔

مدیں نے جب ایک طنز آمیز نظم کہی ہے، تو اس سے چاکر کے سر میں ہوا سما گئی ہے۔ گویا اس جیسا بادشاہ کبھی نہیں گزرا ہے۔ لیکن میں بھی اس کا ہم پلہ اور اس کی طرح طاقت و قوت کا مالک ہوں، میں ایک روز سمہ اور بھٹی افواج کو جمع کر کے، ٹھٹھ کے لشکر جرار کے ساتھ اس کے سر پہ چڑھ دوڑوں گا۔ میں تپتے انگارے ہاتھوں پر رکھ کر، اسے ایک ایسی آگ میں جلا کر بھسم کر دوں گا۔ جسے شمال ہوائیں اور بھڑکائیں گی۔ میں ان بہادر لوگوں کے گھروں میں ایسی آتش سوزاں بھڑکاؤں گا۔ جسے دلی کے ترک بھی نہ بجھا سکیں گے۔

"جب میں نے گھنی داڑھی والوں رندوں سے جنگ لڑی، تو انہوں نے میدانی علاقے چھوڑ کر قلات کے یخ بستہ پہاڑی علاقوں میں جا کر پناہ لی جس روز میں نے یہ کلمات ادا کیے تھے تو چاکر نے ایک کالی گائے ذبح کر کے خیرات کی تھی۔ اگر چاکر میں مردانگی کی صفت ہوتی تو وہ جھل کی گہری ندیوں کے پانی کو پھلانگ کر نہ بھاگتا۔ اور نہ ہی وہ "سوگات" (سوغات) پہ سواری کے بجائے، اس کو معہ اس کی زین اور ساز و سامان کے چھوڑ نہ دیتا۔ اور نہ ہی اس کا دماچی ڈوم گرگین اپنی اونچی لَے والے دماموں کے ساتھ پیچھے رہ جاتا۔ واہ واہ! کیا خوب فتح ہماری ہوئی! میں نے اپنے دشمن پہ ایسا کاری وار کیا کہ وہ اپنی گھوڑیوں پر گورخروں کی مانند دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور مشہور و معروف بمبی کا گوشہ گوشہ اسے زندگی بھر اس کی یاد دلاتا رہے گا۔

"اب چاکر جب بلند و بالا پہاڑوں پہ چڑھے گا تو مندو کے بہادر اور خونریز بیٹے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ وہ تھکا ماندہ بھیڑیے کی مانند کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں سستا کر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا رہے گا۔ وہ ایسے علاقوں کا

رُخ کرے گا۔ جہاں جنگلی پستے پک گئے ہوں اور اس کا منہ، چہرہ اور خمکدار مونچھیں آلڑو[1] بوٹی کے دودھ نما رس سے آلودہ ہونگی۔ اس کے بچے بلوچی زبان سننے کو ترسیں گے۔ اور اس کی عورتیں جامو ٹی (جدگالی) زبان میں اپنے بچوں کو لوریاں سنائیں گی۔ اس کے بچے گلہ بانوں اور شتر بانوں کے ساتھی ہوں گے۔ ان کے ہاتھ مویشیوں کو چراتے ہوئے ہانکنے والی لاٹھیوں کے زخموں سے چور چور ہوں گے وہ سفید چادر میں غلہ کی خیرات مانگتے پھریں گے اور سروں پر کالے گھڑے ڈھوتے پھریں گے۔"[2]

جب سردارِ اعظم شکست کی انتہائی تلخ حقیقت سے دوچار ہوا، تو بدبختی اور مصائب کے سیاہ بادل اس پر اور پوری نسل پر پوری طرح سے چھا گئے۔ اس کا آخری حربہ صبر و تحمل تھا اور اس کے سکون و تسکین کا واحد ذریعہ انتقام جوئی کی امید تھی۔ جنگی واقعات کی بے رحم تاریخ میں، منفعت و نصرت، کبھی نقصان و تاوان کے مساوی نہیں ہوتی اور نہ ہی مسرت و انبساط، رنج و مصائب کی تلافی کرتی ہے۔ یہ خصوصیات ہم سنگ و ہم وزن نہیں ہوتیں۔

لاشاریوں کی برتری و بالادستی، مسرت و نصرت اور منفعت، عبوری اور لمحاتی نوعیت کی تھی، رندوں کی تباہی و بربادی سے، ان کے اعداء اور حریفوں کو مختصر عرصہ کے لئے آرام و سکون اور امن و آشتی نصیب ہوئی مگر وہ پائیدار اور دائمی ثابت نہیں ہو سکی۔ وہ اپنے ناقابلِ تلافی نقصان اور تباہی و بربادی پہ مغموم و نوحہ کناں تھے اور کفِ افسوس ملتے تھے۔ مگر انہوں نے لاشاریوں کی قسمت و

---

(۱) آلڑو ایک چھوٹی سی جنگلی بوٹی ہے۔ جس میں دودھ جیسا رس ہوتا ہے۔

(۲) پاپولر پوئٹری آف بلوچیز از ڈیمز صہ ۲۳-۲۴

عاقبت اور مستقبل پر ہمیشہ کے لئے مہر زوال ثبت کرنے اور ان کے لئے کمال، عروج اور ترقی کے تمام در بند کرنے کا مصمم عزم کر رکھا تھا۔ چاکر نے نفرت انگیز کینہ پروری کی آگ میں جل کر، ایک بیرونی اور اجنبی طاقت سے کمک و اعانت حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ شجاع الدین زنون ارغون[1]، بلوچستان کے منظر اور پردے پر نمودار ہوتا ہے۔ ارغون کی داستان اب علیحدہ طور پر بیان کی جاتی ہے۔

ارغون:۔

ہم قدیم بلوچستانی داستانوں اور نظموں میں ارغونوں کا ذکر بکثرت پاتے ہیں اور بلوچی سیاسیات میں، ان کی سیاسی مداخلت کی تاریخی ماخذوں سے تصدیق بھی ہوتی ہے۔ امیر تیمور اس کائنات کا ایک شہاب آتشین تھا اور جس کی سلطنت کی سرحدیں اقصائے عالم میں پھیلی ہوتی تھیں اور جس نے ایک عالمی سلطنت کے

---

(۱) ارغون خاندان کے سلاطین کے جامع و مفصل حالات کے لیے فارسیں مندرجہ ذیل کتب کا ملاحظہ کریں۔

تاریخ نامہ از سید جامعی۔ تاریخ اکبری از نظام الدین احمد (ایلیٹ اور ڈی ڈوسن) بابر اور ہمایوں کے سوانح۔

(IWES OF BABAR AND HAMAYUN) از ارکسن (ERKSON)

تاریخ فرشتہ جلد چہارم سندھ۔ سندھ کا ڈیلٹائی خطہ

(THE INDUS DELTA COUNTRY) از ہیگ (HAIG) لندن ۱۸۹۴ء

تاریخ ہندوستان (HISTORY OF INDIA)

از ایلیٹ اور ڈوسن۔

حصول کے زعم میں، آباد اور خوشحال شہروں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور جو انسانی سروں کے مینار تعمیر کر کے اپنی قابلِ نفرین فتوحات کا تاج سجائے ہوئے تھا اس کی وفات کے بعد کے بعد تاتاری سلطنت کی عمارت مختصر عرصے میں مسمار ہو گئی اور اس کی سلطنت اس کے خاندان کے مختلف دعویداروں کا اتاک لشکار ہو گئی۔ زمانے کے نوع نوع کے نشیب و فراز اور تغیرات کے بعد سلطان حسین مرزا[۱] جو اس کے پوتے عمر شیخ مرزا کا نواسہ تھا ۸۷۳ھ ہجری (مطابق ۱۴۶۹ء عیسوی) میں ہرات پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا اور آخر کار ۸۷۵ھ ہجری کے دوسرے مہینے (جولائی ۱۴۷۰ء عیسوی) میں خراسان کے تخت و تاج کا مالک بننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بصیرت و تدبیر، قابلِ رشک دیانت اور علم و مطالعہ میں شوق و ذوق کی بدولت مشہور زمانہ بادشاہ تھا۔ امیر شجاع الدین ذوالنون[۲] (ذونون) نے جو ارغون[۳] خاندان کا ایک فرد تھا، قبل ازیں

---

(۱) وہ معزالدین والدنیا، مرزا عبدالغازی، سلطان حسین بہادر خان صاحب قرآن کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

(۲) ذوقن ایک اسلامی لقب ہے اور انسانی نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ عربی لفظ ذو کے معنی آقا یا مالک کے ہیں اور نون کے معنی ایک مچھلی کے ہیں، ذونون، یونس کے ہم معنی اسم ہے جن کو قرآن شریف کے مطابق کسی مچھلی نے نگل لیا تھا۔ ذو کا لفظ بہت سی ترکیبات جیسے ذوالقادر بمعنی طاقت ور اور قدرت رکھنے والا اور ذوالجلال بمعنی پروقار وغیرہ، میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳) ارغون کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ارغون خان ابن اباقا خان ابن ہلاکو خان ابن تولوی ابن چنگیز خان منگول کی اولاد ہیں۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مرتبہ (HOUTSMA) وغیرہ جلد اول صفحہ ۴۲۲۔ لیڈن ۱۹۱۳ ۔ لیکن ریورٹی رقمطراز ہے کہ وہ امیر ارغون کی اولاد ہیں جو تیس

حسین مرزا کی ملازمت میں تھا۔ مگر اس کی ملازمت چھوڑ کر سلطان ابوسعید بہادر خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ قراباغ کے مقام پر ابوسعید کو شکست ہو گئی اور ترکمانوں نے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ امیر ذنون اس کے بیٹے سلطان احمد کے پاس ملازم ہو گیا۔ جو ماوراء النہر کا حاکم تھا۔ اس بادشاہ کے پاس تین سال کی خدمت کے بعد ترکمان اور ارغون امراء میں جھگڑا ہو گیا اور بالآخر اس نے سلطان احمد کے دربار کو خیرباد کہہ کر دوبارہ سلطان حسین مرزا کی ملازمت اختیار کر لی ۸۷۶ھ ہجری (۱۴۷۱ء، ۱۴۷۲ء عیسوی) میں اس نے اسے غور اور زمین داور کا والی مقرر کر دیا۔ امیر ذنون نے ۸۸۶ھ ہجری (۱۴۷۸ء، ۱۴۷۹ء عیسوی) میں ہزاروں اور نقودریوں کے زیر تسلط علاقوں کو فتح کر لیا۔ اس واقعہ کچھ عرصہ بعد، اسے قندھار اور اس کے تحت ملحقہ علاقوں کا والی تعینات کیا گیا اور فرح اور سکھر تعلقہ کے علاقے اس کو بخشش میں دے دیئے گئے۔ پھر جلد ہی شال (کوئٹہ) مستونگ، پشنگ (پشین) اور سیوی (سبی) اور ان کے ساتھ ماتحت ملحقہ علاقوں کو بھی اس کی جاگیر میں اضافہ کر کے شامل کیا گیا۔ امیر ذنون کبھی بھی ایک آزاد اور خود مختار بادشاہ نہیں تھا۔ جیسا کہ ایک تاریخ[1] میں دعویٰ کیا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ تیموری خاندان کے زیر نگین رہا ہے۔ اپنے حاکم اعلیٰ اور بادشاہ کی خاطر ازبکوں کے ساتھ لڑائی میں اس کے مارے جانے کی حقیقت سے مذکورہ بالا بیان کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا

سال تک ایران کی سرزمین کا حکمران رہا اور اس نے بمقام طوس ۸۷۳ھ ہجری (مطابق ۱۴۶۸-۱۴۶۹ء عیسوی) میں وفات پائی۔

(۱) ترخان نامہ مترجمہ ایلیٹ جلد اول صفحہ ۳۰۴

ہے۔ اس نے مرزا بدیع الزمان کی اس کے والد کے خلاف کشمکش میں اعانت کی اور اس شہزادے نے اس کی بیٹی سے شادی کر لی۔ امیر ذوالنون اس لڑائی میں کام آیا جو مرزا بدیع الزمان نے ازبک بادشاہ، شیبانی خان کے خلاف ۹۱۳ھ ہجری (۱۵۰۷-۱۵۰۸ عیسوی) میں ہرات کے شمال میں بادغیس کے قریب بیلاق مارل اور ارباط علی شیر کے درمیان لڑی تھی۔ شاہ بیگ اپنے والد کی جاگیروں کا وارث بنا۔ سلطان حسین مرزا ۹۱۱ھ ہجری (۱۵۰۵ء-۱۵۰۶ عیسوی) میں بادغیس کے قریب بابا الہٰی کے مقام پر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کی وفات کے فوراً بعد، اس کے بیٹوں بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا دونوں نے مشترکہ طور پر کاروبار حکومت سنبھالا۔ ان کے کمزور دور میں حکومت کی گرفت نہایت ڈھیل پڑ گئی تھی۔ موخرالذکر جلد فوت ہو گیا۔ اور اول الذکر کو، جس کی شخصیت شان و شوکت، عزم و وقار اور کمزوری کا مجموعۂ اضداد تھی۔ ازبکوں نے اس کے تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ اس طرح اس تیموری خاندان کی حکومت اور حکمرانی، ایشیا کے مخصوص حالات کے نشیب و فراز کی بھینٹ چڑھ کر، خراسان میں ہمیشہ کیلئے اپنے آخری انجام کو پہنچی۔ شاہ بیگ کی مملکت کو دونوں جانب سے دو طاقت ور دشمنوں سے خطرہ لاحق تھا۔ اسے ایک طرف فارس کے حاکم شاہ اسماعیل سے خطرہ تھا۔ جس نے ازبک حاکم کو ۹۱۶ھ ہجری (دسمبر ۱۵۱۰ء) میں شکست دینے کے بعد، پورے خراسان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا اور ہرات پر قبضہ جمایا تھا۔ دوسری طرف ظہیر الدین بابر مرزا سے خطرہ تھا جس نے ۹۱۰ھ ہجری کے چوتھے مہینے (دسمبر ۱۵۰۴ء عیسوی) میں کابل اور اس کے ماتحت ملحقہ علاقوں پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد، قندھار[1] پر قبضہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بابر کی ارغون

[1] بابر از لین پول (LANE POOLE) آکسفورڈ ۱۸۹۹ء۔

خاندان کے ساتھ کوئی دشمنی اور مخاصمت نہیں تھی۔ مگر عمومی طور پر ان کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کے تعلقات مفقود تھے۔ کابل اور اس کے ماتحت علاقوں کا حاکم الغ بیگ ابن سلطان ابو سعید سنہ ۹۰۷ ہجری (سنہ ۱۵۰۱ عیسوی) میں فوت ہو گیا تھا۔ اور اس کا نابالغ بیٹا مرزا عبدالرزاق اس کا جانشین بنا۔ سنہ ۱۵۰۲ء میں شاہ بیگ ارغون کے بھائی محمد مقیم نے کابل پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ نیز اس پر طرہ یہ کہ اس کی بہن سے شادی رچا لی۔ مگر اسے جلد ہی بزور شمشیر کھینچتے ہوئے تخت و تاج سے اتار گیا۔ مرزا الغ بیگ بابر کے چچا کا بیٹا تھا۔ بابر نے ارغونوں کی اس حرکت کو تیمور کے خاندان کے عز و وقار اور افتخار کی ہتک تصور کیا۔ جب بابر پہلی مرتبہ کابل میں داخل ہوا تو اس وقت اس کا حاکم محمد مقیم ارغون تھا۔ بابر کے اپنے بیان کے مطابق، امیر ذوالنون بیگ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد اس نے قندھار کی پیش قدمی کی تو شاہ بیگ ارغون اور محمد مقیم، دونوں اس کی مزاحمت کرنے نکل پڑے۔ لیکن اس کو شکست ہو گئی اور وہ پسپا ہو گئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے، شاہ بیگ شال میں چلا آیا اور محمد مقیم زمین داور چلا گیا۔ اور انھوں نے وہ علاقہ (قندھار) چند شرائط پر بابر کے حوالے کر دیا۔ ارغون سرداروں کے تمام خزائن بابر کو مل گئے۔ اس ضمن میں وہ اس خیال کا اظہار یوں کرتا ہے: "میرے پاس کبھی اتنی بڑی دولت نہیں تھی اور شاید ہی میں کبھی اتنی دولت دیکھ سکوں"(۱)۔ اس نے ارغونوں کے خزائن اور دولت پر قبضہ جمانے کے بعد، محمد مرزا بابر کا لقب ترک کر کے بابر بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنے

---

(۱) ملاحظہ ہو: تزک بابری۔

بھائی ناصر مرزا کو قندھار میں بٹھایا اور خود واپس کابل چلا گیا۔ اس اثنا میں شاہ بیگ کے بھائی محمد مقیم نے حرص و آز میں آ کر شیبانی خان کے ساتھ مراسلت شروع کر کے ساز باز کی اور اس سے کمک کا طلبگار ہوا۔ ازبک حاکم طوفان کی مانند قندھار پر امنڈ آیا۔ شہر کو فوراً خالی کر دیا گیا۔ مگر اس نے بالاحصار کا دفاع کیا۔ تاہم ناصر مرزا اس قلعہ اور اس جگہ کو شاہ بیگ کے حوالے کرنے پر راضی ہو گیا جو اپنے بھائی اور شیبانی خان کے ساتھ بالاحصار کے سامنے موجود تھا۔ ناصر خان بعجلت کابل واپس چلا گیا۔ شاہ بیگ کو اپنے خاندان اور ساتھیوں کے تحفظ و سلامتی کی خاطر کسی ایک جگہ کی ضرورت تھی اور اس کی اس فوری ضرورت نے اسے سیوی (سبی) پر قبضہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۵۱۱ء میں اس نے سبی پر از خود حملہ بول دیا۔ اور سخت مزاحمت کے بعد وہ اسے فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا[1]۔ سبی سے اس نے فتح پور کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی جو کہ گنداوہ کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس وقت پردل برلاس کی اولاد اس پر حکمران تھی۔ برلاس سردار نے ایک ہزار دولت شاہی، شہسوار بیرزائی، کوریائی اور نوزگار ہی آدمیوں کو معہ بلوچ

---

(۱) (B LOCHMANN) اپنے ترجمہ کردہ آئین اکبری کے اس حصے میں جس میں اکبر کے منصب داروں کا ذکر ہے، ایک ماخذ، معاصر الامراء کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ شاہ بیگ نے اپنے والد کے جانشین بننے کے بعد" اس نے سیوی (سبی) کو سندھ کے بادشاہ جام نظام الدین ننده سے لے لیا" یہ بیان قطعاً غلط ہے۔ یا اس نے اس کا غلط حوالہ دیا ہے۔ شاہ بیگ کا والد ۹۱۳ھ ہجری (۸-۱۵۰۷ عیسوی) میں مارا گیا تھا نہ کہ ۸۹۱ھ ہجری (۱۴۸۶ عیسوی) میں۔

لوگوں کے، جن کی کل تعداد دو تا تین ہزار نفری کے برابر تھی، مجتمع کیا۔[1] معمولی مزاحمت کے بعد شاہ بیگ نے ان کو شکست فاش دی اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس نے فتح پور پر قبضہ کر لیا۔ شاہ بیگ واپس سبی چلا گیا اور وہاں اپنے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر باقیماندہ فوج کے ساتھ قندھار کی راہ لی۔

۱۵۱۴ء میں بابر بادشاہ نے دوبارہ قندھار پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر وہ اس مہم کے دوران بیمار پڑ گیا اور اسے اپنے ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ اسی سال شاہ بیگ دوبارہ عازم سبی ہوا اور یہاں سے اس نے مرزا ترخان مغل کی سرکردگی میں ایک ہزار شہسوار اندرون سندھ روانہ کر دیئے اور یہ جام تندہ کے ماتحت علاقے پر پہلا ارغون حملہ تھا۔ یہ فوج گاہان اور باغبانان کے علاقوں میں داخل ہو گئی۔ اس فتح کے بعد شاہ بیگ پھر قندھار لوٹ گیا۔ ۹۲۱ھ ہجری (۱۵۱۴ عیسوی) میں اس کے اور اس کے بیٹے مرزا شاہ حسین کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی۔ اس کا بیٹا اسے چھوڑ کر بابر بادشاہ کی پناہ میں چلا گیا۔ ۱۵۱۷ء میں بابر بادشاہ نے اس کے زیر تسلط علاقے پر یلغار کر دی اور اسے زبردست قوت اور جرأت مندانہ سخت حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مسلسل حملوں اور یورشوں نے شاہ بیگ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ باہمی مذاکرات اور حتیٰ کہ صلح جوئی کے ایک ذلت آمیز عہدنامے سے ہی اس کو طاقتور اور قوی بابر کے حملوں اور عتاب سے عافیت و نجات مل سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے دیرینہ اور پیچیدہ تنازعات اور تلخیوں کو بھلا کر نہایت ہی معمولی قیمت پر اپنی عزت اور سلامتی کا سودا کر لیا۔ اس نے اپنی شان و شوکت اور شہرت و عظمت بابر کے قدموں میں ڈال کر شہر کی کلید اس کے حوالے کر دی اور خوش قسمتی

---

(۱) تاریخ معصومی

اور بدبختی کے محور اور آماجگاہ اس شہر کو خالی کر دیا۔ اس طرح بابر کو کسی جانی نقصان و زیان کے بغیر اور بلا مزاحمت اس شہر پر غلبہ حاصل ہو گیا اور اس کشور کا بہترین شہر اس کے قوانین کے تابع ہو گیا۔ اپنے اس آبائی ورثے سے محروم و نامراد ہو کر شاہ بیگ نے شال (کوئٹہ) کی راہ لی اور دو سال تک پشتنگ (پشین) کو اپنا مرکز بنایا۔ پشتنگ سے وہ سبی چلا گیا۔ ۱۵۱۷ء کے اختتام پر جام نظام الدین اپنی اعلیٰ صفات اور شہرت و عظمت کے ساتھ اس جہان فانی سے کوچ کر کے عالم حقیقی کو سدھارا اور اس کا قنوطی بیٹا شہزادہ فیروز اس کا جانشین بنا۔ وہ فطرتاً بزدل اور بے حوصلہ شخص تھا۔ شاہ بیگ نے اپنے جھوٹے وقار اور مصنوعی جلال کو جلا بخشنے کے لیے ایک سیاسی حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے اب سندھ کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جو حکمرانی کے لیے ایک پرامن خطہ تھا اور یہ ایک ایسی مہم بھی جو روحِ عصر و تقاضائے وقت سے ہم آہنگ تھی۔ ۹۲۶ھ ہجری (جنوری ۱۵۱۸ء عیسوی) میں اس نے سمہ خاندان کے دارالحکومت ٹھٹہ پر حملہ کیا۔ قسمت نے اس کی یاوری اور اس مہینے کی ۲۰ تاریخ تک اس نے اس تاریخی شہر پر قبضہ مکمل کر لیا۔ شکست خوردہ شہزادہ اور دیگر لوگوں نے اسے بلا شرکتِ غیرے سندھ کا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ اس طرح سمہ خاندان کے دورِ حکومت کا، بلا کسی نقصان و زیان کے خاتمہ ہو گیا، وہاں سے وہ واپس سبی چلا آیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے مستحکم شہر بکھر کو اپنا مرکز بنایا۔ اس نے اپنے ذہنی سکون اور فیاضی کے اظہار کی خاطر، ٹھٹہ کے قریب ایک علاقہ شکست خوردہ اور حوصلہ باختہ شہزادہ جام فیروز کو تحفہ کے طور پر بخش دیا۔ گجرات پر حملہ کرنے کی مہم میں دوران سفر ۹۲۸ھ ہجری کے آٹھویں مہینے میں (۱۵۲۲ء میں جولائی کے اختتام پر) اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور دوسرے جہان کو

کو کوچ کر گیا۔[۱]

شاہ بیگ کے جانشین مرزا شاہ حسین، ایک ہزار شہسواروں کے رسالے کے ساتھ بکھر سے سبی واپس آیا اور سات روز کے سفر کے بعد وہ اس شہر میں پہنچا۔ اس نے چھتر اور لہڑی کے راستے سفر کے دوران، بلوچوں کے رند اور لگسی قبائل پر ان کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا۔[۲] ۹۳۱ھ ہجری کے آغاز میں اس نے ملتان کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ اور اس نے سرکش بلوچوں کو سزا دی۔ جنہوں نے اُوچ کے قریب اس کی طاقت و قوت کو للکارا تھا۔ ملتان کے لنگاہ حاکم، شاہ محمود نے ارغون حملہ آور کا مقابلہ کرنے سے پیشتر ہی، اپنے علاقے کا ایک بڑا حصہ، مرزا شاہ حسین کی نذر کر دیا۔ اور دوسرے سال ان کے درمیان پھر محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر لنگاہ حاکم اپنی ولایت ملتان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی طاقت و قوت اور اختیار و اقتدار، بلوچ قبائل کے جنگجو اور جانباز رندوں، دو دائیوں اور کورائیوں کا مرہون منت تھا۔ اور سقوط کے ساتھ ہی لنگاہ خاندان کا دور حکومت ۹۳۳ھ ہجری کے وسط میں (جنوری ۱۵۲۷ء عیسوی) کو اپنے زوال کو پہنچا۔[۳] لیکن اس کے فوراً بعد، بابر

---

(۱) سر ہنری پوٹنگر شاہ بیگ کی وفات کے بیں ایک بالکل غلط بیان کا اظہار کرتا ہے کہ "شاہ بیگ کو مغل فوجوں سے بچنے کی خاطر بکھر خالی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور یہ کہ اس نے عالم یاس و ملال میں بکھر اور ٹھٹہ کے درمیان خودکشی کر لی۔

(۲) تاریخ معصومی

(۳) ترخان نامہ

بادشاہ نے جو اُس وقت دہلی کے تاج و تخت کا مالک تھا، ملتان صوبہ کو اپنے بیٹے مرزا کامران کو دے دیا۔ سنہ ۹۵۰ ہجری (سنہ ۱۵۴۳ء - سنہ ۱۵۴۴ عیسوی) میں مرزا شاہ حسین نے خطۂ سبی کی حکومت سلطان محمود خان ابن میر فاضل کوکلتاش کے سپرد کر دی۔[1] مرزا شاہ حسین نے ٹھٹھ کے نواح میں، جہاں فرشتۂ اجل اس کا منتظر تھا سنہ ۹۶۲ ہجری (فروری سنہ ۱۵۵۴ عیسوی) میں عین عالم شباب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور اسے بالآخر مکہ (MECCA) میں دفن کیا گیا۔ جہاں وہ اپنے والد کی قبر کے ساتھ ابدی نیند سو رہا ہے۔ اس کے بعد ارغون خاندان کے وارثوں کو قدرت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابھرنے کا موقع نہیں دیا اور سندھ پر ان کی فرماں روائی ترخانوں کے حصے میں آئی۔[2]

---

(۱) وہ ایک خود مختار شہزادہ نہیں تھا۔ لفظ سلطان ترکی اور مغل اسمار میں کبھی کبھی سابقہ اور لاحقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ماں پٹھانوں کے کانسی قبیلے سے تھی اور وہ شال (کوئٹہ) میں اقامت پذیر تھی۔ قدیم زمانے میں خلفاء اپنے وفادار منصب داروں اور صوبوں کے والیوں کو سلطان کا خطاب عطا کرتے تھے۔ بعد ازاں یہ لقب خانِ اعظم، چنگیز خان کی اولاد کے لئے مخصوص ہو گیا۔ جیسا کہ مرزا کا لقب، امیر تیمور کی اولاد کے لئے مخصوص و مروج تھا۔ ایران کے صفوی حاکموں نے اپنے غلاموں اور ماتحتوں کو اس لقب سے نوازا اور توخی غلزئیوں کے ایک افغان سردار کو یہ لقب، کسی صفوی حکمران سے عطا ہوا تھا۔ عثمانی ترکوں کے عثمانی خاندان نے بھی یہ لقب اختیار کیا ہوا تھا۔

(۲) ترخان منگولوں کی ایک ذیلی شاخ سے ہیں۔ ترخان کی اصطلاح ایک لقب تھا جو وہ اپنے طاقتور امراء کو عطا کرتے تھے۔ خانِ اعظم کے بعد ترخان سردار سب سے زیادہ قوت وقار اور مراعات کا حامل ہوتا تھا۔ ترخانوں کے ارکان مرتبہ و حیثیت کے لحاظ سے برتری اور فوقیت رکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ چنگیز خان از ہیرالڈ لیمب۔

بیوزغ کا ارغون شہزادی کے ساتھ معاشقہ:۔

اب ہم چاکر کی طرف لوٹ آتے ہیں اور ارغونوں کے ساتھ اس کے روابط اور معرکہ آرائی کا ذکر کرتے ہیں جو آج تک بلوچ مغنیوں اور ڈوموں کے کلام و گفتار کا محبوب اور پسندیدہ موضوع ہیں۔ چاکر کا قریبی عزیز اور گشکوری قبیلے کا جدِ اعلیٰ عظیم بیوزغ[1] بلوچوں کے سردارِ اعظم معتبر ترین امراء اور زعماء میں سے تھا۔ اس کا نام اس زمانے کی بلوچی داستانوں اور اساطیر، رزم و بزم اور امن و جنگ کے تمام واقعات میں عزو شرف کے ساتھ نمایاں طور پر نظر آتا ہے ایک اعلیٰ نسل زن ہونے کی بنا پر بیوزغ ہمیشہ اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا اور نسل میں ایک عالی دماغ دانشور اور گوہر نایاب تھا۔ وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا۔ جو اپنے معقول اور مؤثر دلائل و منطقی براہین سے قانون کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ایک نڈر اور بے باک سرفروش اور جانباز تھا۔ وہ اپنے مزاج اور نظریات و خیالات سے ہم آہنگ قابلِ فخر محب وطن تھا۔ وہ ایک مشہور و معروف شاعر تھا۔ فیاضی اور سخاوت میں یکتائے روزگار تھا۔ اپنے روابط، تعلقات اور فیصلوں میں راستگو اور منصف مزاج واقع ہوا تھا۔ عشق و محبت کے معاملات میں انتہائی دلیر تھا۔ اور اپنے زمانے کی انتہائی خوبصورت، پرکشش اور دلپذیر شخصیتوں میں سے ایک تھا۔ وہ کسی سے متاثر نہ ہونے والی شخصیت، حربی صلاحیتوں اور

---

(۱) مغربی علاقوں کے بلوچوں یعنی مکران، خاران، ایرانی بلوچستان اور افغانی بلوچستان میں وہ بیبرگ یا بیبرک کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حکمت عملیوں، دلیری اور حوصلہ مندی کے اوصاف جمیلہ میں شہرت کی وجہ سے یکتائے روزگار ہستیوں میں شمار ہوتا ہے۔ غالباً ۱۴۹۵ء میں، قندھار جانا پڑا جہاں وہ امیر شجاع الدین کی حسن و جمال کی پیکر بیٹی، شہزادی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوگیا اور اسے دل دے بیٹھا۔ بیوزع کا یہ کمال تھا کہ وہ صنفِ نازک کو جلد ہی اپنا گرویدہ و شیدا بنا کر انہیں اپنے دامِ محبت میں پھنسا لیتا تھا۔ شہزادی بھی اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئی اور والہانہ طور پر اس پر فریفتہ و شیدا ہو گئی۔ اس نے چند روز قندھار میں قیام کیا۔ ایک رات اس کی طفلانہ خواہش اور اضطراب و بیقراری نے اسے اس امر پر مجبور کر دیا کہ دربانوں اور پہرہ داروں کی موجودگی میں ہی اس محل میں داخل ہونے کی کوئی تدبیر کرے، وہ اپنی خواہش اور مہم کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا اور سنہری بستر پر محوِ استراحت شہزادی سے ملاقات کی اور سات یوم اس کے ساتھ خفیہ طور پر ملاقاتوں اور مجلسوں میں گزارے۔ ایک رات اس نے ہزاروں خطرات مول لے کر شہزادی کو بلند و بالا ایوان سے باہر نکالا اور اسے اپنے ساتھ پشتِ زین پر بٹھا کر اپنی بہترین تازی نسل کی بہترین اور برق رفتار گھوڑی موسوم "مل" کو مہمیز لگائی اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ رات بھر وادیوں پہ وادیاں عبور کرتا، ندیوں پہ ندیاں پھلانگتا اور دیہاتوں کے دیہات روندتا ہوا سفر کرتے کرتے دوسری صبح جب خورشید عالم تاب، افقِ مشرق پر نمودار ہوا تو اس کی برق رفتار گھوڑی کوئٹہ کے جنوب مشرق میں، دشت کے میدان میں پہنچ چکی تھی اور مغل شہزادی نے بلوچ سرزمین پر پہنچ کر آرام و سکون کا سانس لیا۔ ڈھاڈر پہنچنے پر بیوزع نے اپنی بہترین سیاسی بصیرت اور حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چاکر کے بدترین اور کٹر دشمن، لاشاری سردار گہرام کے ہاں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ اسے اس کی مدد و اعانت حاصل اور اس کی افواج و طاقت کا تعاون و

تک اس کے اپنے رندوں کو حاصل ہو سکے۔ وہ گنداوہ پہنچا اور وہاں سے گہرام کے ہاں گاجان چلا گیا۔ جہاں اس نے، تین گھنٹوں کے مسلسل سفر کی بنا پر تھکن سے چور اپنی صبا رفتار گھوڑی کی زین اتار کر اسے باندھا۔ لاشاری سردار نے غیر متوقع طور پر بیورغ کو دیکھ کر حیرت و استعجاب اور مسرت و انبساط کے ملے جلے جذبات کے عالم میں، ایک بلوچ سردار کی روایتی، فراخ دلی، وسیع النظری اور رواداری کے شایانِ شان، خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اور معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے، ان سے یوں مخاطب ہوا "اے بلوچوں کے میر! آؤ! آپ کو آپ کی محبوبہ کو پورے تحفظ و سلامتی کے ساتھ یہاں قیام کرنے کے لئے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔" بیورغ نے اسے اپنی پوری داستان سنائی اور اس گرامی قدر اور معزز میزبان کے ہاں سات روز تک قیام کیا۔ مگر پھر بھی اس نمک نہیں چکھا۔ گہرام نے صورت حال کی طوفانی نزاکت کو پوری طرح محسوس کیا۔ مگر وہ اپنی خوش نامی اور عزت و وقار کو دھبہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس تھی کہ عظیم خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے اور امنڈتا ہوا طوفان پوری بلوچ نسل کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ چنانچہ اس نے ایک ایلچی اس تند پیغام کے ساتھ چاکر کے پاس روانہ کر دیا۔ "مکران چاکر سے کہہ دو کہ ایک سردار کا یہ مشغلہ اور کام نہیں ہے کہ وہ کھیل میں وقت صرف کرے اور نہ ہی طفلانہ حرکتیں کرے۔ بیورغ ایک بہت بھاری بوجھ اٹھا لایا ہے۔ وہ بادشاہ کی متاع لوٹ کر اپنے ساتھ لے آیا ہے۔" بیورغ بلوچی خزانے کا وہ نایاب اور گوہر یکتا تھا اور اس کو بچانے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی بھی ہیچ تھی۔ چاکر کی محبت نے جوش مارا اور وہ بیورغ کی عزت و وقار اور آن و شان پر اپنی پوری قوت و طاقت اور عزو توقیر داؤ پر لگانے پر کمر بستہ و آمادہ ہو گیا۔ اس نے اسے کسی دوسرے پر ترجیح دو

ترقی دے دی۔ سردار اعظم کو یہ احساس تھا کہ انتہائی ناگفتہ بہ مصائب و تکالیف، نوشتۂ تقدیر کی منشا کے مطابق ہنوز اس کی منتظر ہیں۔ اس نے اور لاشاری سردار نے پوری نسل کو مصائب و آلام کی آتش سوزاں میں جھونکنے کا عزم صمیم کر لیا۔ ذونون نے ارغون افواج کا مقابلہ کرنے کی خاطر اپنے جیالے جانبازوں کو مسلح کر کے پہلے سے تیاری کر لی۔ امیر ذونون انتہائی سرعت کے ساتھ پانچ روز تک۔ بیوزنج کے بدولت سراغ کو لیتا سفر کرتا ہوا ایک ناقابلِ تسخیر اور طاقت ور مغل لشکرِ جرار کے ساتھ سبی کے قلعوں کے دروازے پر نمودار ہوا۔ ایک بہادر، حوصلہ مند اور صاحب بصیرت، کسی صورت میں بھی تدبر، عقل و دانش اور انصاف کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کرتا۔ تدبر، دوراندیشی، دانش مندی اور عدل گستری کے زریں اصولوں نے بیوزنج کو اپنے سنگین جرم کا خود کوئی حل تلاش کرنے پہ مجبور کر دیا۔ اس نے آشوب انگیز نازک صورتحال کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا اور اپنی نسل کو اپنی جان سے زیادہ تصور کر کے اسے اپنی ذات پر ترجیح دی۔ اسے اس موذی طاعون کا بخوبی علم تھا۔ جس کا وہ شکار ہو سکتا تھا اور اس تباہی و بربادی کا مکمل طور پہ ادراک تھا۔ جس کا اسے سامنا کرنا تھا، ٹھوس وزنی اور معقول دلائل و براہین سے قوی احتمال جنم لیتے ہیں۔ اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔ مبادا کہ وقت اسے ضائع کر دے۔ اس کا مقصد جلد فیصلہ کرنے کا متقاضی تھا۔ اس نے ہمت و حوصلے سے کام لیتے ہوئے رات کی تاریکی میں کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنی شمشیرِ بُرّان کو ہاتھ میں لیا، وہ خاموشی سے مغلوں کے ڈیرے میں داخل ہو گیا اور پہرہ داروں کو موت کے گھاٹ اتار کر اس خیمہ میں گھس گیا، جس میں میر ذونون اپنے طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد محوِ خواب تھا۔ وہ اچانک نیند سے بیدار ہو گیا اور ایک اجنبی کو خود آلود شمشیر برہنہ کے ساتھ موجود پا کر، اس پر خوف و ہراس طاری

ہو گیا۔ اس نے خوف زدگی کے عالم میں حیرت و استعجاب سے دریافت کیا: "تم کون ہو؟" اس نے جواباً کہا: "میں بیوزع بلوچ ہوں، خوش قسمتی سے پیدائشی سردار ہوں۔ سردارِ اعظم میر چاکر کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتا ہوں اور اس کی مہربانیاں اور کرم نوازیاں شامل ہیں۔" دونوں نے نفرت سے بھرپور حقارت بھرے انداز میں کہا "تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" بیوزع نے جواب دیا: "میں یہ جرأت کر کے آیا ہوں کہ آپ کے ضمیر، رواداری، بردباری اور صابری کی آزمائش کروں، میں اپنے اس گناہ کبیرہ اور مکروہ جرم کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہوں، جس نے میرے ماضی کو داغدار بنا دیا ہے، میرے چمکتے سورج پر گہن لگا دیا ہے اور میں اپنی اس واحد بدعملی اور غلطی کی بنا پر اپنی تمام شرافت اور عزت و وقار کھو بیٹھا ہوں۔ سب سے برتر و اعلیٰ وہ عادلِ مطلق ہے۔ جو دو جہاں کا حاکم ہے اور جس کے عدل و انصاف پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا ہوں اور مجھے اور میرے فعلِ بد کے انجام کو اسی پر چھوڑ دیں، ورنہ اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر، یہ میری شمشیر برآن حاضر ہے، اور میرا شرمسار اور خاکسار سر آپ کی خدمت میں ہے، جو جی چاہے کریں۔" بیوزع اپنے گناہ اور جرم پر نادم اور خوف زدہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بہادری و جرأت مندی نے اس کو زبان عطا کر دی تھی۔ اس نے اپنی فہم و دانش اور پُرتاثیر قوتِ گفتار، ذہنی بیداری اور دقیقہ سنجی کی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر، دونوں کی آتش انتقام کو سرد کر دیا اور اس کی بدنامی و رسوائی سے متاثرہ عزت و وقار کی لاج رکھ لی۔ اس کی راست گوئی اور بے مثال بہادری و جرأت نے مغل کو متاثر کر کے در طرۂ حیرت میں ڈال کر اسے رام کر لیا۔ اس نے اسے شفقت و محبت سے گلے لگا لیا اور اسے شرف و اعزاز کے ساتھ اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ ان دونوں نے ساری رات باہمی گفتگو میں گزاری۔ جب صبح ہوئی

توارغون سردار نے اپنے فوجی سپہ سالاروں اور معتمد امراء کو طلب کر کے ان کے ساتھ گرجدار آواز میں یوں خطاب کیا: "یہ ہے بیوزع جس کی مجنونانہ حرکت کی بنا پر ہماری فوجوں کو یہاں آنا پڑا ہے۔ وہ تم سب لوگوں کی غفلت کے سبب میرے پہرہ داروں کو میرے خیمے میں داخل ہو گیا ہے اور میری جان بخش دی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس عالی نسب مرد آہن کے ہاتھوں میں دیتا ہوں، جس کا ہم پلہ میں نے تو کبھی دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔" ذنون نے بیوزع کو ایک سبک رفتار گھوڑی تحفہ میں پیش کر کے اسے سرخ ریشمی قبا پہنا دی، جو کچھ ہو چکا تھا اس کی اطلاع میر چاکر کو دی گئی اور تمام بلوچ سرفروشوں اور امراء نے جنگ کی تباہ کاریوں سے بچنے پر سکھ کا سانس لیا۔ بیوزع نے بے جگری کا مظاہرہ کر کے پوری نسل کو ایک بہت بڑے ہولناک طوفان سے بچا لیا تھا اور حریف قوتوں کو خون خرابے اور تباہی و بربادی سے محفوظ کر لیا تھا۔ اس طرح ارغون خاندان کی غیرت و ننگ و ناموس عزت و وقار اور شان و شوکت پر ایک باریک پردہ ڈال دیا۔ ذنون فوراً قندھار لوٹ گیا۔ اس کے فوراً بعد چاکر نے تمام بلوچ شرفاء امراء کو جمع کر کے انتہائی مسرت و انبساط کے ساتھ ایک باسطوت و پرشکوہ جشن کا انعقاد کیا۔ تمام مذہبی رسومات کے ساتھ شہزادی گرانناز کی اس کے ساتھ شادی کرا دی۔

لاشاریوں کی نیست و نابودی:۔

نلی کی جنگ کے بعد چاکر کی لاشاریوں کے ساتھ محاذ آرائی اور مخاصمت بارہ مہینوں کی مدت کے دوران میں مسلسل کبھی معطل رہی اور کبھی تازہ تر ہوتی رہی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی شکست کے ذمہ داروں کو عبرت ناک سبق دے

کران کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔(۱) اس کے بغض و عناد، شتر کینہ، عز و وقار اور انتقام گیری کا تقاضا تھا کہ گہرام کو اس کے کئے کی سخت سزا دیئے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے اور اپنی جرأت مندی اور ہیبت کی دھاک بٹھانے کی خاطر، نیز اپنے وقار کی سربلندی اور فرض منصبی کو نبھانے کے لئے، اسے انتقام لینے کا ایک کامیاب حربہ استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس نے اپنے کٹر دشمن گہرام کو عبرتناک سبق سکھانے کے لئے ہمسایہ فرمان رواؤں سے بیرونی تعاون و کمک حاصل کرنے کا عزم کر لیا۔ ملتان کے لنگاہوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنے وقار کو داؤ پر لگا سکیں۔ کیونکہ وہ حلیف کے طور پہ نہایت کمزور تھے اور دشمن کی حیثیت سے بے ضرر واقع ہوئے تھے۔ سندھ کے فرمانروا جام نندہ کے لاشاریوں کے ساتھ بظاہر دوستانہ اور خیر سگالی کے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاکر پہلے ہی اس کے شمالی جانب تک، اپنی قلمرو کی حدود کو پھیلا چکا تھا۔ وہ شکست خوردگی کے باعث بپھرا ہوا تھا۔ اور آتش انتقام اس کے سینے میں سلگ رہی تھی، اس کی ہوشمندی الوالعزمی

---

(۱) رندوں اور لاشاریوں کی دشمنی و مخاصمت وقت گزرنے کے ساتھ شدت اختیار کرتی اور بڑھتی رہی اور روزمرہ کا معمول بن کر وہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی۔ صدیوں تک رندوں نے اپنے دشمن لاشاریوں کو نسل در نسل اپنی انتقام جوئی کا نشانہ بنا کر شدید انتقام گیری کا مظاہرہ کیا۔ دل ملک رند جو اپنی فیاضی اور شاندار مہمان نوازی کے لئے مشہور زمانہ تھا۔ اپنی نظم میں اس حقیقت کا یوں اظہار کرتا ہے: "خدا کسی رند کو لاشاری نہ بنائے۔ (جیسا کہ) ایک مسلمان ہندو نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ برہمنوں کے کفر و الحاد کے مظہر رشتہ زنار کو گلے میں حائل کر سکتا ہے۔"

تدبر اور خواہشات کا یہی تقاضا تھا کہ وہ اپنے شمالی فرمانرواؤں سے امداد و کمک کا طالب ہو۔ چنانچہ اس بصیرت افروز نظر انتخاب خراسان کے حاکم سلطان حسین مرزا پر پڑی، جس کی طاقت و قوت کا اسے احسن طور پر علم تھا اور اس کے اخلاص و ایثار اور احسان پر اسے کامل اعتماد تھا۔ مگر اسے اس شرارت کا علم نہیں تھا کہ گہرام نے چند ماہ قبل ہرات میں اپنے قیمتی اور نایاب تحفے تحائف بھیج کر اسے طمع و تحریص اور لالچ سے رام کر لیا تھا۔ بلوچوں کے سردارِ اعظم نے بیوزع کو ساتھ لے کر تجربہ کار رند جانبازوں کی فوج کے جلو میں ۱۵۰۵ء میں اپنی عزم استقلال الوالعزمی کے ساتھ خراسان کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا۔ وہ آندھی کی طرح علاقوں پر علاقوں اور قبیلوں پر قبیلوں کو روندتا اور عظیم خطرات و مصائب سے نمٹتا ہوا سیستان کی حدود میں داخل ہوا۔ جو کہ ایسا خطۂ ارض تھا۔ جس کا کوئی دوست نہیں ہوتا تھا اور دوستی کی ابجد سے نابلد تھا۔ راستے میں کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آئے کہ سردارِ اعظم کو اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے اور پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر صرف شکار پر ہی انحصار کرنا پڑا۔ سیستان سے وہ براستہ گرم سیر، فرح پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اپنی توسن انداز گھوڑیوں کی باگیں خراسان کے دارالمقام کی طرف موڑ دیں۔ اپنی روانگی کی جگہ سے تین ہفتوں کے سفر کے بعد وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچے، اور ہرات کے مقام پر شاہِ ہرات سے ملاقات کی جو سطوت و دبدبہ اور خوشحالی و شادمانی کا مظہر تھا۔ سلطان نے سردارِ اعظم کا شاہانہ طریقے سے تزک و احتشام اور عزت و تکریم کے ساتھ استقبال کیا جو اس کے عظیم خاندان اور ملوکیت کے شایانِ شان تھا۔ چاکر نے سلطان سے اپنے آنے کا مدعا بالصراحت بیان کیا اور اپنے موقف کو ٹھوس اور معقول دلائل و براہین سے مؤثر طور پر درست اور منصفانہ ثابت کیا۔ لیکن اسے کوئی حوصلہ افزا، مثبت اور قطعی جواب نہیں ملا۔ سلطان کی والدہ نے

نے بھی، جو اپنی پاکبازی، نیکوکاری، شرافت، عزّ و وقار، عالی نسبی اور حسن و جمال کے لحاظ سے کشورہائے شرقیہ کی ہر ملکہ کی ہمسر و ہم پلہ اور ہم مرتبہ تھی، اپنے بیٹے کو اس امر پر راضی کیا کہ وہ بلوچوں کے سردار کے ساتھ تعاون کرے جو بڑی توقعات لے کر اس کے دربار میں آیا ہے۔ چاکر نے اپنے بیان کے مطابق اس کی بہادری اور صداقت پرکھنے کی خاطر سلطان کی طرف سے عائد کردہ اور مجوزہ کچھ آزمائشوں اور امتحانات پر پورا اترنے کے بعد وہ اس کی کمک و تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا(۱)، چنانچہ سلطان حسین مرزا نے اس وقت کے حاکم قندھار شجاع الدین ذنّون کو حکم صادر کیا کہ وہ لاشاریوں کے خلاف مہم کی قیادت کرے۔ اپنے مقصد اور مشن میں کامیابی کے بعد چاکر نے شاہی میزبان سے اجازت طلب کی اور اسی پرانے راستے کو اختیار کرتے ہوئے واپس اپنے وطن چلا آیا۔ گہرام کو چاکر کی اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں، عزائم اور ارادوں اور سازشوں کا بخوبی علم تھا۔ مگر اس نے ایک بڑے زلزلے اور عظیم آفت کے علاج کی خاطر معمولی سا حربہ اختیار کیا۔ جیسا کہ ایک مہلک مستعدی مرض کے علاج کی خاطر ایک معمولی سی گولی استعمال کی جائے۔ اسی طرح اس نے معمولی تیاریاں کر لیں۔ وہ فتح و نصرت کے نشہ سے مخمور تھا۔ مگر اس کا نشہ و خمار لمحاتی اور نہایت تلخ ثابت ہوا، تقدیر کی لہریں بھی، سمندر کی طلاطم خیز لہروں کی مانند ہوتی ہیں۔ چند ہفتوں کے اندر اندر ذنّون درہ بولان کے دروازوں سے گزر کر اپنی لامحدود افواج قاہرہ کے ساتھ سبی کے میدان میں داخل ہو گیا۔ سردارِ اعظم نے قلعہ کے قریب اس کا والہانہ استقبال کیا۔ اس دوران گہرام

---

(۱) بلوچوں کی مقبول عام شاعری (POPULAR POETLY OF BALUCHIES) از لانگ ورتھ ڈیمز جلد اول۔ صفحہ

کے کانوں میں بھنک پڑ گئی اور ارغون سردار کے پہنچنے کا اسے علم ہو گیا۔ اس کی واحد حکمت عملی ذنّون کو لالچ دے کر اسے رام کرنا تھا۔ اور اس نے بلا تامل ایسا ہی کیا۔ حرص و آز اور طمع و لالچ وہ بدنما داغ رہا ہے کہ جس سے تاریخ کے کئی جفاکش کرداروں کی عزت و وقار کی چمک دمک ماند پڑ چکی ہے۔ ذنّون نے ایک ہفتہ قیام کے بعد، اپنے حاکم اعلیٰ اور چاکر دونوں کو فریب دے کر اپنی فوجوں کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن بیوزع کی حوصلہ مندی اور دور اندیشی فوری طور پر کام آئی۔ اس نے فوری طور پر ایک مؤثر چال چلی۔ جس نے ارغون سردار کے حرص و طمع اور فریب و مکاری کو بے رحمی کے ساتھ ناکام بنا دیا مغل لشکر کی روانگی سے ایک روز قبل اس نے اپنے چند معتمد رند سرفروشوں کو درۂ بولان کے قریب کسی بلند چٹان پر گھات میں بٹھا دیا اور ان کو ہدایت کر دی کہ ذنّون کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیں[1]! بیوزع خود فوج کی ہمراہی میں چلا گیا اور درہ بولان کے دہانے سے کچھ دور وہ ذنّون کے بھائی کو لشکر سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام فوج آگے بڑھ گئی اور وہ ان کے عقبی دستوں کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلتے گئے۔ جب فوج درہ بولان میں داخل ہو گئی تو رند سرفروش ذنّون کے بھائی پر ٹوٹ پڑے اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق بیوزع کو کچھ معمولی زخمات پہنچا کر غائب ہو گئے۔ بیوزع فوراً گھوڑے کو مہمیز لگا کر لشکر تک جا پہنچا اور ذنّون کو بتایا کہ کچھ لاشاریوں نے گھات لگا کر ان پر اچانک ہلہ بول دیا اور اس کے بھائی کو قتل کر کے اسے زخمی کر دیا ہے۔ ذنّون نے طیش میں آ کر نہایت تندی و تیزی اور جوش و خروش کے ساتھ اپنی ہمیشہ ثابت قدم،

---

[1] اس کا نام بلوچی روایات کے مطابق حیدر تھا۔

وفاشعار، با صلاحیت اور مستعد اور ہر آزمائش میں پوری اتری ہوئی فوج کو فوراً حکم دیا کہ وہ کچھی کے میدانوں پر حملہ کر دیں۔ پوری فوج ایک ناگہانی سیلاب کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ڈھاڈر و شوران کے راستے لاشاریوں کے مراکز گنداوہ اور گاجان پر آفت الٰہی بن کر ٹوٹ پڑی، پورے علاقے کو تاخت و تاراج کر کے تباہ و برباد کر ڈالا، تمام دن، بلا تمیز عمر و جنس، انتہائی وحشت و بربریت کے ساتھ انسانوں کا قتلِ عام جاری رہا۔ ارغون سرداروں کا پرہول عتاب، قرب و جوار کے قبائل پر بھی نازل ہوا اور ان کو چُن چُن کر صفحۂ ہستی سے مٹایا گیا۔ گاجان کو نذرِ آتش کر کے خاکستر کر دیا گیا اور نواحی دیہاتوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ انسانی جانوں کا اس قدر بڑے پیمانے پر ضیاع ہوا کہ جو لوگ مغل فوج کی وحشت و بربریت اور عتاب سے اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے، وہ بعد ازاں "چک لاشاری" کے لقب سے موسوم و مشہور ہو گئے۔ جس کے معنی وہ اطفال ہیں جو ارغونوں کی تلواروں سے زندہ بچ گئے اور یہی اصطلاح از منۂ مابعد میں لاشاری قبیلے کی آئندہ نسلوں کو اپنے آپ کو صحیح النسل ثابت کرنے کا وسیلہ بنی۔ اس محشر کے دوران گہرام اپنی جان بچا کر زندہ بھاگ کھڑا ہوا اور قریبی پہاڑوں میں جا کر دم لیا۔ ذلّت انسانی خون سے ہولی کھیل کر اپنے غم و غصے اور غیض و غضب کی اپنی مجنونانہ آگ کو ٹھنڈا کر کے واپس قندھار چلا گیا۔ گہرام کی شہرت کا ستارہ ڈوب گیا اور لاشاریوں کی قوت و طاقت اور گنداوہ اور گاجان پر ان کے استحقاق و مالکیت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

بسی سے روانگی :-

بسی اور کچھی کے زرخیز اور گرم میدان، سازشوں کا گہوارہ ثابت ہو کر

افراتفری و ہنگامہ خیزی اور مصائب و آلام کی اصلی تصویر پیش کرنے لگے۔
سبی اور گنداوہ دونوں کو، اس دور کے بلوچستان میں بارود کے نالوں سے تشبیہ
دی جا سکتی ہے۔ مصائب و آلام کے انبوہ کثیر نے پوری نسل کو اپنی لپیٹ میں
لے کر اس تابندہ و درخشاں سورج کو گہن لگا دیا اور اس کے استحکام و پختگی
کو دائمی طور پر شکست و ریخت سے ہمکنار کر دیا۔ زوال و انحطاط کی قوتوں کو کوئی
طاقت نہیں روک سکی۔ نا اتفاقی، حسد، ضد اور بدبختی کے سائے ہر طرف لہرانے
لگے۔ اور ان سب عوامل نے مجموعی طور پر بلوچ حاکمیت اور فرماں روائی کے
شیرازے کو درہم برہم کر کے، اس کی ایسی صورت و ہیئت بنا دی۔ جیسا کہ ایک
جسم بغیر سر کے ہو۔ بے شمار مصائب و آلام کے علاوہ، رندوں کی پستی و ذلت
اور لاشاریوں کی مکمل تباہی و بیخ کنی نے چاکر کو بار بار جھنجوڑا اور اس کے دماغ
اور اعصاب پر مؤثر کن اثرات چھوڑے۔ ایک جاگیردارانہ سردار کی ذاتی خرابیاں
اور اس کے اوصاف ہی صرف وہ رشتہ تھا۔ جو مختلف، متنوع اور بے آہنگ و
متضاد قبائل کو ایک لڑی میں پرو سکتا تھا۔ ایک عظیم سپاہی، تجربہ کار سپہ سالار
اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر اسے ہمیشہ اپنے حریفوں
کو مطیع و فرماں بردار بنانے میں کامیابی نصیب ہوتی تھی۔ اور متحارب قبائل کے
ان کے متضاد و مختلف مقاصد کو ناکام بنانے اور دبانے میں اسے کامیابی ہوتی
تھی۔ ایک لائق فائق اور خداداد صلاحیتوں کا حامل قائد ہونے کی حیثیت سے
چاکر کو اس نسل کے اندر وبا کی مانند برائیوں کے پھیلنے کا احساس تھا۔ لیکن
اس کے سدباب اور مداوا کے لئے خون کی ندیاں بہانے کی ضرورت تھی۔ جس کے
لئے نہ تو وہ تیار تھا اور نہ راضی۔ لہٰذا اس نے اس امر کو ترجیح دی کہ
وہ خود وحشت و بربریت کی وبا کا روپ اختیار نہ کرے۔ رند قلمرو کی کمزوری

کے بعد، قبائل کے درمیان آویزش و چپقلش اور دشمنیوں اور مخاصمتوں
جنم لیا اور مختلف النوع جاگیردارانہ سرداروں کے درمیان حاسدانہ جذبات
خواہشات اور متضاد مفادات پوری شدت کے ساتھ سر اٹھانے لگے۔ رند
کے احکامات جن کو سب تسلیم کرتے تھے اور ان کی عسکری قوت جس سے سب
خوف کھاتے تھے۔ اب مختلف بلوچ قبائل اور امراء کی مرضی و منشا کے تابع ہو
جن میں سے ہر ایک اپنے ذاتی فائدے اور مقصد کے حصول کے لئے کوشاں اور
سرگرم عمل تھا۔ چاکر کے کٹر دشمن لاشاری پہلے ہی شکست کے بعد عظیم صدمہ
جانکاہ کا شکار ہو چکے تھے۔ اندرونی و بیرونی خطرات سے اپنے کو محفوظ پاکر
تند و تیز مزاج رند امراء اور ذیلی شاخوں کے درمیان ناقابل استیصال رقابتوں
نے جنم لیا۔ خانہ جنگی کبھی کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تو کبھی دوسری کو۔ کبھی
کسی ایک قطعہ زمین پر مختصر عرصہ کے لئے کوئی اپنا قبضہ و تسلط جماتا تو کبھی دوسرا
ان تیز رفتار تبدل و تغیرات اور مستقل خانہ جنگیوں اور باہمی آویزشوں دلگیر ہوکر
نے چاکر کو پریشان کر دیا۔ اور یہ اس قلمرو کے جلد خاتمے کا باعث بن رہی تھیں
جس کا وہ بانی تھا۔ ان تمام حوادث و سانحات اور واقعات سے حتماً یہی عیاں تھا
کہ ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ اور وہ عالم مایوسی، ناامیدی اور بیزاری میں
ان تمام آفات، افراتفری اور طوائف الملوکی کے عواقب و نتائج کو محسوس کرتا تھا
یہی میں اب زندگی، بار بار شنیدہ داستان کی مانند، غیر مؤثر، غیر دلکش اور
خشک ہو گئی تھی۔ وہ اب اس متاثر بلوچی ہیئت و ڈھانچے کو مزید چلانے اور
جلا بخشنے میں بڑی دقت محسوس کرتا تھا۔ مبادا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ
ہو جائے۔ اور اس سے بھی ابتر ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک نئی سرزمین پر
از سر نو قسمت آزمائی کرکے نئی فتح و نصرت اور کامرانی کا خواہاں تھا۔ مختلف

قوتوں کے دباؤ اور تحریک کی بنا پر، اس نے اس جگہ کے قریب ہونے سے دور تر ہونے کو ترجیح دینے کا بڑی ہوشیاری اور معاملہ سنجی سے حتمی فیصلہ کیا۔ آخرکار سردارِ اعظم نے لاشاریوں کی مکمل تباہی کے چھ سال بعد ۱۵۱۲ء کے آغاز میں جنگ و جدل اور خونریزی سے بیزار ہو کر پُرامن زندگی گزارنے کی خاطر پنجاب کا رُخ کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ پنجاب میں اس کی قسمت تو جاگ جائے گی۔ مگر اس پیمانۂ عمر لبریز ہو جائے گا۔ وہ ایک لشکرِ جرار اور انبوہِ کثیر کے ساتھ، اپنے تمام خزائن کو اونٹوں کے قافلوں پر لاد کر سبی سے روانہ ہوا اور سنجاراندی کے قریب مشرق میں واقع نزدیکی پہاڑوں میں ایک خوفناک درہ (جو بعد ازاں "جاکر تنگ" یعنی درہ جاکر کے نام سے موسوم و مشہور ہوا) کے راستے داخل ہو گیا، وہ ایک ایسا تنگ اور پرخطر درہ تھا، جس میں سے انسان اور جانور گھٹنوں کے بل رینگ کر گزر سکتے تھے۔ اس درہ کو عبور کرنے کے بعد اس نے وہاں پڑاؤ کیا۔ ایک صبح سویرے وہ شب گزشتہ کی مغموم و افسردہ حالت میں سبی کا آخری نظارہ کرنے کی خاطر، قریبی پہاڑوں کی بلند ترین چوٹی پر چڑھ گیا اور اس شہر کو الوداع کہا جو اسے جان و دل سے زیادہ عزیز و محبوب تھا۔ جس کی یادیں آخری دم تک اس کے دل میں نقش تھیں، سبی کے میدان کی جانب اس نے اپنا رُخ کر کے گرم آہیں بھریں۔ اور قدرت کی ستم ظریفیوں کا زبانِ حال میں شکوہ کرتے ہوئے اس کے پُرسکوت اور خاموش جذبات کے سمندر میں آنسوؤں کی لہریں مچلنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے مردانگی اور عزت و وقار کے موتی ٹپکے اور وہ عالم تنہائی میں دل گداز اور پُرسوز انداز میں نغمہ سرائی کرتے ہوئے یوں گویا ہوا: "اے سبی! الوداع!! تمہاری تین چیزیں مجھے سب سے زیادہ مرغوب، عزیز اور پسند تھیں۔ تمہارے خربوزے، موٹی چکی والے

والے میٹھے اور چٹانوں کی ٹھنڈی چھاؤں —" تب وہ لمحہ بھر کے لئے پتھر کی مانند جامد و ساکت رہا۔ اور پھر پت روگ کی مانند اس نے اندر ہی اندر چاٹنے والے غم و اندوہ کو ہلکا کرتے ہوئے کفِ افسوس مل کر انتہائی غصے کے عالم میں گہرام کی مذمت و ہجو کرتے ہوئے نغمہ سرا ہو کر اسے یوں بد دُعا دی ۔

"اے گہرام تجھے نہ گنداوہ نصیب ہو نہ قبر!!"

یہ الفاظ ایک عظیم انسان کی برق تپیدہ سانسوں اور آہوں کے پیکر تھے. اور یہ سخت بد دُعا حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ گہرام ہمیشہ کے لئے گنداوہ سے ہاتھ دھو بیٹھا اور ابھی تک اس کی آخری اور ابدی آرام گاہ کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ بد قسمت لاشاری سردار بلوچستان کی سرزمین سے اپنی مہمات اور واقعات سے بھرپور زندگی کے ساتھ عنقا ہو گیا۔ مایوسی و پریشانی کے عالم میں پھر کبھی وہ اپنے نام کا سکہ نہ چلا سکا۔ اور عظمت و شہرت سے محروم ہو گیا۔ آخرکار اس کے وقار و افتخار کے بلند بانگ دعوے اس کے غائب ہونے کے ساتھ ہی اپنی موت آپ مر گئے اور دیارِ غیر میں اس کی قسمت نے یاوری نہیں کی۔ جہاں اس کے احباب و اقارب نہ تھے کہ جو اس کے لئے آنسوؤں کے چند قطرے بہا کر اس کی نذر کرتے۔ اس کی بے جا ولولہ انگیزی، خواہشات اور مخاصمت نے اس خطہ ارض اور نسل کو چاکر سے محروم کر دیا اور شہاب ثاقب کی مانند اس کا نام و نمود نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے باقیماندہ لاشاریوں کے ساتھ گجرات کاٹھیاواڑ کی جانب ہجرت کر گیا۔ جس کا صرف یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ چاکر اپنی عظمت کے لحاظ سے بلوچ نسل کے لئے قابلِ صد تحسین و ستائش تھا جب کہ گہرام اپنے کبر و نخوت کی بنا پر اپنے ان حریف رندوں کے مقابلے میں معمولی صفت و ثنا کا بھی مستحق نہیں ہے۔ جن کی وساطت اور وسیلے ہی سے وہ

آئندہ نسلوں میں پہچانا جاتا ہے۔

کوہستان مری میں چند روز قیام کے بعد سردار اعظم نے آگے کوچ کرنے کی تیاریاں کر لیں۔ ایک روز وہ اپنی زرہ بکتر اتار کر ایک ہموار مگر بلند و بالا پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اور پر جوش انداز میں اسے یہ کہہ کر نیچے پھینک دیا۔ "میں مادر وطن کو اپنی مختصر و حقیر یادگار نذر کرتا ہوں" زرہ بکتر اس بلند و بالا چوٹی پر آج تک معلق ہے، جو انسانی دسترس اور پہنچ سے باہر ہے۔ یہ ایک ایسا عجیب و غریب اور حیرت انگیز کرشمہ اور معجزہ ہے کہ عام عقیدہ کے مطابق چاکر کی روحانیت اور دینداری پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے دریائے سندھ کے مشرقی جانب واقع خطے کی طرف کوچ کا آغاز کیا۔ مگر پٹھ رندوں کی ایک شاخ نے سربراہ میر بجار کی قیادت میں جو سبی پر اپنی حریصانہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ایک مقام پر جسے آج تک "بجار روڈ" کے نام سے پکارا جاتا ہے ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور یہ بجار وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے کئی مختلف النوع اور متضاد قبائل کی شاخوں کی ذیلی شاخوں کو متحد و یکجا کر کے مضبوط جتھا کوشش آہنی مری قبیلے کی تنظیم کی۔ کچھ دیگر بلوچ قبائل یعنی بلیدی، پیرو زانی، کیازئی، ڈومبکی، کوش کی ایک شاخ اور شتر وغیرہ بھی رندوں کے اصل جتھے سے الگ ہو گئے۔ بلیدی، پیرو زانی اور کیازئی نے موجودہ بگٹی کے کوہستانی علاقوں میں سکونت اختیار کر لی، ڈومبکی موجودہ لہڑی اور پھلیجی کے میدانوں میں پھیل گئے۔ لیکن بلیدیوں کو جلد ہی سندھ کے بالائی علاقوں کی طرف دھکیلا گیا۔ کوش اور شتر سکھر (سندھ) اور بہاولپور علاقے کے جنوبی حصے میں اقامت پذیر ہوئے۔ چاکر باقی ماندہ قبائل کے ہمراہ کاہان کے قریب سے گزر کر بور بوڑ کے راستے سے ہوتا ہوا، مری بگٹی کے کوہستان کی سرحدوں سے اس پار چلا گیا — جہاں وہ پھر دوبارہ کبھی داخل

نہ ہو سکا۔ ! اس طرح اس نے پہاڑوں کے حصار میں محفوظ اپنے اس دل کو تا ابد خیرباد کہا، جس کی پہاڑی سرحدیں ہر جارح کی بری نیتوں کے عزائم اور امیدوں کو بری طرح ناکام بنا کر خاک میں ملا دیتی تھیں اور جن کے سائے تلے ہڑنڈ و داجل کے میدان واقع تھے۔ اس نے یہاں دو ماہ تک قیام کیا اور کئی قبائل یعنی مزاری، گورچانی، دریشک، لغاری، سبزوار، قیصرانی، لنڈ، گشکوری اور کھوسہ وغیرہ کوہستان بلوچستان اور دریائے سندھ کے درمیان واقع پورے ڈیرہ جات کے علاقے میں پھیل گئے۔ جو روجہان سے لے کر ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے تک دو سو میل سے زائد رقبہ پر محیط ہے۔ اب سردار اعظم کے پاس اصل رند جانباز رہ گئے۔ جن کے ساتھ وہ لنگاہ حاکم کی قلمرو میں داخل ہو گیا۔

چاکر کی سبی سے روانگی کے بعد بلوچستان لامتناہی قبائلی جنگوں کی آماجگاہ بن گیا۔ شاندار ماضی گرد و غبار میں نہاں ہو گیا اور بلوچ قوم اپنے افتخار کی بام ثریا سے تحت الثریٰ میں اتر گئی۔ انسان کی بد خصلتیں اور بد اعمالیاں، جو عموماً مصائب و آلام کے وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ انتہائی سرعت کے ساتھ رو بہ عمل ہو گئیں۔ کوئی بھی بلوچ سردار آقا اعلیٰ و ارفع ثابت نہ ہوا اور نہ ہی وہ بلوچستان پر بلوچوں کی حاکمیت دوبارہ قائم کر سکا۔ پورا بلوچ خطہ ارض ایک مشترکہ وجود اور یگانگت سے عاری رہا۔ کوہستان قلات اور سبی جن کو چاکر نے بزور بازو و شمشیر بلوچوں کا خون دے کر فتح کیا تھا۔ بغیر کسی آقا و مالک کے رہ گئے۔ قلات کا بلوچ والی قتل کیا گیا۔ موجودہ مری بگٹی کا کوہستانی علاقہ حریف بلوچ قبائل پر رندوں اور بلیدیوں کے لئے جنگ و جدل اور قتال کا باعث بنا۔ لہڑی اور کچھی کے میدانی علاقوں کے قبائل بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے

کے خلاف محاذ آرا ہوئے۔ پورا علاقہ سالہا سال تک قبائل کی باہمی خانہ جنگیوں اور لڑائیوں سے جہنم زار بن گیا اور سرداروں نے سلب و لبب، لوٹ مار، رہزنی، اور انتقام گیری میں مسرت و خوشی محسوس کی۔ ہر طرف انتشار، افتراق، افراتفری طوائف الملوکی، بدامنی اور زوال و انحطاط کے آثار نمایاں تھے۔ انتشار اور لوٹ مار کے نظام کو فروغ دیا گیا اور ہر شخص اپنی قوت و طاقت کے بل پر اپنی قسمت کا آذر بت ساز خود تھا۔ اخلاقیات کو منقود کر دیا گیا اور بد اخلاقی کا اخلاق پر اطلاق کیا گیا۔ چاکر کا قلعہ، جو اس کی داستان میں مرکزی مقام تھا۔ اب بھیڑیوں اور لومڑیوں سے بھر کر ان کا مسکن بن گیا اور سبی کی حیثیت گر کر ایک غیر اہم معمولی دیہات کی سی ہو گئی۔ بلوچوں کے آلام و مصائب اور تباہی و بربادی سے، قریبی حریص اور مشتاق حاکم، طاقتور شاہ بیگ ارغون نے فائدہ اٹھایا اور وہ بعد ازاں تاریخ ساز رندول کے چھوڑے ہوئے خلا کو پُر کرنے کے لئے حرکت میں آگیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کی صفوں میں جو نا اتفاقی اور کشمکش شروع ہوئی تھی۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور بلوچستان اب بھی نیلگوں آسمان کے نیچے اپنے مقام کا متلاشی ہے۔

سردارِ اعظم نے اس نسل کے روائتی اضطراب و سیمابیت کے وقتی تند و تیز بہاؤ میں بہہ کر دریائے سندھ کو عبور کیا اور ملتان کے لنگاہ فرماں روا کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ اپنی کہانی کو جاری رکھنے سے قبل یہ مناسب ہو گا کہ ہم لنگاہوں[1] کی مختصر تاریخ بیان کر دیں۔ جن کے ساتھ چاکر کا قریبی واسطہ پڑا تھا اور ہندوستان کی تاریخ کے اوراق میں بلوچوں کی مسرت و شادمانی اور مصائب و

---

(۱) لنگاہوں کے تفصیلی حالات و کوائف کے لئے قارئین گرفن کی کتاب ص ۴۹۲ ملاحظہ کریں۔

آلام کا ملتان اور اس کے ماتحت علاقوں کی قسمت سے قسم ہی تعلق قائم ہے۔

لنگاہ خاندان کا دور حکومت:-

دہلی کے سید خاندان کے دور حکومت کا خاتمہ اس کے آخری فرماں روا سلطان علاؤالدین (۸۴۷ھ ہجری بمطابق ۱۴۴۳ء۔ ۱۴۴۴ء عیسوی) کی طوفانی حکمرانی کے اختتام پر ہوا۔ پورا ہند خلفشار و ہلچل کا شکار ہو گیا۔ کئی دور افتادہ صوبوں اور باج گزار ریاستوں کے والیوں نے آزادی اور خود مختاری اختیار کر لی۔ اس ہنگامہ خیزی اور شورش کے دوران میں ملتان کے لوگوں نے ملتان کے صوفی بزرگ شیخ الاسلام بہاءالحق والدین ذکریا کی خانقاہ کے متولی شیخ یوسف کو اپنا حاکم مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسے رائے سہرا[1] نے ہٹا کر ملتان کے تخت و تاج کا خود مالک بن بیٹھا اور قطب الدین کا لقب اختیار کر لیا۔ یہ لنگاہ قبیلے[2] سے تعلق رکھتا تھا اور لہڑی[3] کا ایک زمیندار تھا۔ اس نے اپنے کافی لوگوں کے ساتھ آ کر

---

(۱) وہ "رائے" پکارا جاتا تھا۔ مگر مذہباً مسلمان تھا۔

(۲) لنگاہ قبیلے کے لحاظ سے راجپوت ہیں۔ مسٹر ڈو (Mr. DOW) فرشتہ کے حوالے سے لنگاہوں کو پٹھان گردانتا ہے۔ گو کہ فرشتہ خود اپنی تاریخ میں ان کو پٹھان نہیں بتلاتا۔ ٹوڈ (TOD) ان کا رشتہ سولنکی (SOLINKI) راجپوتوں سے ملاتا ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو تحفہ اکبر شاہی، منتخب التواریخ کا مصنف رائے سہرا کو، لہڑی کا زمیندار اور لنگاہ قبیلے کا سردار بادن خان سندھی (جت) کے نام سے لکھتا ہے۔

شیخ یوسف کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس نے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیٹی اس کے عقد میں دے کر "حرم" میں داخل کر دی تھی اس طرح وہ ریاست کی سب سے ممتاز اور با اثر شخصیت بن گیا تھا۔ اس طرح تقدیر نے ایک لومڑی کو بھیڑوں کے باڑے کا نگہبان بنا دیا۔ یہ بے ہمت، بزدل، اخلاق باختہ، منافق، مکار، عیار اور غدار فطرت شخص بیک وقت ایک لومڑی اور بھیڑیا تھا جو انتہائی حریص، تیز طرار اور چالاک و عیار تھا۔ اس نے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کر کے اس کی مراعات، عنایات اور اعزازات سے بخوبی استفادہ کیا۔ لیکن چونکہ نیکی اور اچھائی کا کوئی دوست نہیں ہوتا اور بسا اوقات نیکیوں اور اچھائیوں کی وافر بارش سے برائیاں سر اٹھاتی ہیں۔ اس لئے اس شخص نے بھی اپنی وفاداریوں اور اعتماد کے رشتوں کو توڑ کر بلا حیل و حجت، بلا جواز اور بلا رحم و کرم کے اپنے ایک ایسے مربی شخص سے تخت و تاج چھین لیا۔ جس نے کبھی بھی بادشاہی کے زعم میں اپنی تلوار کو خون کے دھبے نہیں لگنے دیئے اور اپنے اعلیٰ حسب نسب اور کردار کی بنا پر وہ بلا شک و شبہ جائز طور پر تخت و تاج کا مالک تھا۔ مگر اسے اس طرح ناجائز طریقے اور بے ایمانی و عیاری سے اقتدار سے محروم کیا گیا کہ دیانت و شائستگی اور اخلاق و تہذیب کی حدود میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ریورٹی (RAVERTY) کا خیال ہے کہ رائے سہرا بیوی (سبی) اور اس کے ماتحت علاقوں کا حکمران تھا[1]۔ لیکن سبی پر اس کی حکومت کا کوئی ثبوت اور آثار نہیں ملتے۔ اس لئے ہم اس خیال پر انحصار و اعتبار نہیں کر سکتے۔

۱۴۵۱ء میں جب سلطان بہلول (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء عیسوی) لودھی

---

(۱) ملاحظہ ہو (NOTES ON FRONTIERS) از ریورٹی صفحہ حاشیہ

افغان کے زمانے میں، جو لیسین زئی خیل کے پرانکی شاخ سے تھا اور اپنی نسل میں سے دہلی کے تخت پر بیٹھنے والا اوّلین شخص تھا۔ بلوچوں کے ہوت قبیلے کے کافی لوگوں نے کیچ مکران سے کوچ کر کے بالائی سندھ اور ملتان میں ہجرت کی، سہراب دودائی[1] اپنے بیٹوں اسماعیل خان اور فتح خان کے ساتھ کیچ سے سلطان حسین لنگاہ[2] کے دربار میں ۱۴۷۲ء میں اس وقت آیا جب سلطان بہلول نے ملتان پر ایک ناکام حملہ کیا تھا اور اسے پسپا ہو کر واپس جانا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے اپنے دارالسلطنت کو جونپور کے حکمران سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ سلطان حسین لنگاہ[3] نے سہراب دودائی کو ایک علاقہ جاگیر کے طور پر بخش دیا۔ جو ڈیرہ جات کے علاقوں کے علاوہ کرور اور دھنکوٹ کے قلعے کے درمیانی علاقے پر مشتمل تھا۔ دودائیوں کے نقشِ قدم پر چل کر کافی دیگر بلوچ قبائل نے وہاں کا رُخ کیا اور ہمعصر لنگاہ حکمران نے ان کو بھی جاگیریں عطا کیں[4]۔ سلطان کی فوج کا بہترین حصہ بلوچوں پر مشتمل تھا۔ امیر جاکر اپنے بیٹوں میر شہداد اور میر اللہ داد کے ساتھ سلطان شاہ محمود ابنِ سلطان فیروز شاہ ابن سلطان حسین لنگاہ کے دورِ حکومت میں ملتان میں وارد ہوا۔ اس نے اپنے کمزور ہاتھوں مگر بے پناہ محبت و اخلاص اور عزت و وقار سے بھرپور دل کے ساتھ ان کا استقبال کیا آثارِ رحیمی کا مصنف تذکرہ کرتا ہے کہ سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹ء - ۱۵۱۷ء عیسوی)

---

(۱) دودائی بلوچوں کے ہوت قبیلے کی ایک معروف شاخ ہے۔

(۲) مآثر رحیمی از عبدالباقی النہاوندی مرتبہ محمد ہدایت حسین جلد اوّل صہ ۲۷۸-۲۷۹ -

(۳) میر المتاخرین از سید غلام حسین طباطبائی صہ ۱۰

(۴) مآثر رحیمی جلد اوّل صہ ۲۷۸-۲۷۹ -

دور حکومت میں جام بایزید (جو سندھ کے جام نندہ کا ایک قریبی عزیز تھا) اور
لنگاہ کے درمیان تنازعہ اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، جس کی بناء پر سکندر لودھی
پنجاب کے والی دولت خان کو ان کے درمیان مداخلت کرکے مصالحت کرنے کا
حکم دیا اور اس نے ان کے درمیان امن قائم کردیا۔ یہی مصنف اس ضمن میں
لکھتا ہے کہ میر چاکر خان رند، اپنے دو بیٹوں اللہ داد اور شہداد کے سبی سے
ملتان، دولت خان کی مداخلت و صلح جوئی کے فوراً بعد آیا تھا جو کہ ۱۵۱۲ء کا واقعہ
ہے۔ جام بایزید، جام نندہ کے ساتھ اپنے دعویٰ و استحقاق کے نتیجے کے طور پر
تنازعہ اور مقابلہ کے بعد ملتان آیا تھا اور سلطان شاہ حسین نے شورکوٹ میں اسے ایک
بڑی جاگیر عطا کی تھی۔ جام بایزید نے اپنی جاگیر میں سے ایک بڑا حصہ امیر چاکر اور
اس کے بیٹوں کو دے دیا[1]۔ فرشتہ اس بیان کی تصدیق و توثیق کرتا ہے اور
رقمطراز ہے کہ میر چاکر اور اس کا بیٹا میر شہداد سبی سے ملتان آئے تھے معلوم ہوتا
ہے کہ یہ مصنف چاکر کی زندگی کی تاریخ اور نسب نامے سے ناواقف تھا۔ تاہم وہ
آگے اپنے ماخذ نظام الدین بخشی کی تاریخ کے حوالے سے ذکر کرتا ہے کہ ملتان میں
میر شہداد رند نے شیعہ عقیدے کو رواج دے کر فروغ دیا تھا[2]۔

ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کے ساتھ روابط و تعلقات:

چاکر کی حسین حیات میں دریائے سندھ کے اس جانب کے بلوچوں اور

---

(۱) مآثر رحیمی جلد دوم صفحہ ۲۷۶ — ۲۷۹

(۲) تاریخ فرشتہ محررہ ۱۱۹۳ ہجری (برٹش میوزیم) نمبر مسودہ اے ڈی، ڈی

۲۵۵ صفحہ ۶۰۹ — ۶۱۲، اور صفحہ ۶۱۵

بلوچستان کے بلوچوں کا سیلاب، صوبہ ملتان اور ضلع سرگودھا کے قصبہ جات یعنی بھیرہ، خوشاب، شاہپور میں متواتر امنڈ آنا شروع ہوا۔ بابر بادشاہ اپنی یادداشتوں (تزک) میں رقمطراز ہے کہ ۲۰ فروری ۱۵۱۹ء میں "میں نے حیدر علمدار کو بلوچوں کی جانب روانہ کیا جو کہ بھیرہ اور خوشاب کے علاقے میں آباد تھے۔ دوسری صبح وہ ایک سبک رفتار "تیچک" گھوڑے کو بطور پیشکش لے کر آئے اور انہوں نے اطاعت اختیار کرلی"[۱] ۱۵۲۴ء میں بابر نے لاہور کے قریب بہار خان اور مبارک خان رودیس (ابراہیم لودھی کے لشکروں) کو شکست فاش دے دی۔ اس نے دیپالپور تک پیش قدمی کی جہاں پنجاب کا طاقتور والی دولت خان لودھی اور اس کے بیٹے غازی خان اور دلاور خان اس کے ساتھ مل گئے، جنہوں نے ابراہیم لودھی کے خلاف بغاوت کرکے بعد، بلوچوں کے پاس پناہ لی تھی۔ بابر اپنی خود نوشت سوانعمری (تزک بابری) میں دولت خان لودھی کو یاد دلاتا ہے کہ اس نے کس طرح اسے اور اس کے بیٹوں کو بلوچوں کے ہتک آمیز سلوک اور گرفت سے نجات دلائی تھی۔[۲] پنجاب کے بلوچوں کے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ جاگیر کے یا اس کے بیٹوں کے زیر اثر اور ماتحت تھے۔ بابر بادشاہ اور اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کے ساتھ تعلقات استوار تھے۔ انہوں نے لوٹ مار، غارت گری اور بغاوت کے کرتوتوں کو ترک کرکے، پرامن مشاغل میں زندگی گزارنی شروع کی تھی۔ ہمایوں اپنے والد کے بعد تخت نشین ہوا۔ شیر شاہ سوری کے ساتھ دس سال کی جنگ و جدل کے بعد، اسے ہندوستان بدر ہونا پڑا۔ شیر شاہ کی موت کے دس برس بعد ۹۶۲ ہجری

---

(۱) "MEMOIRS OF BABAR" از ارسکن جلد دوم صفحہ ۹۸

(۲) المنسکی (ALMINSKY) صفحہ ۳۲۴ - ۳۲۵

سے پہلے سال محرم (دسمبر ۱۵۵۴ء) کے اختتام پر ہمایوں نے اپنی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے پیش قدمی کی اور ۹۶۲ ہجری (جولائی ۱۵۵۵ء) میں اس نے دہلی کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ بلوچوں نے ہمایوں کے مفتوح اور فاتح ہونے کے وقت اپنی تمام روایتی بہادری اور فراخدلی کے ساتھ برابر تعاون کیا تھا۔ شیر شاہ کے ہاتھوں ۱۵۳۹ء میں شکست کھانے کے بعد، بدقسمت شہنشاہ کو تقدیر کے سخت تھپیڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اسے جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑی۔ جب وہ اوکاڑہ کے قریب واقع قصبہ سرگودھا پہنچا تو اس کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور اس نے چاکر کے امراء میں سے ایک بخشو بلوچ سے مدد طلب کی تھی۔ اس نے آٹے سے بھری ہوئی سو کشتیاں شکست خوردہ بادشاہ کو امداد کے طور پر فراہم کیں۔ بعد ازاں ان کشتیوں پر سوار ہو کر بادشاہ نے دریا عبور کیا۔ شہنشاہ کی بہن گلبدن بیگم بخشو کی اس امداد و کمک کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتی ہے "اللہ تعالیٰ اپنا رحم و کرم بخشو پر نازل کرے، جس نے سخت مشکل گھڑی میں شہنشاہ کی خدمت کی"[1]۔ بلوچستان سے گزرتے ہوئے نوشکی (بلوچستان) میں رکا جہاں اس علاقے کے سردار ملک خطی نے اس کو خوش آمدید کہا اور اس کی مدد کی، جسے ابوالفضل نے "صحرا کے رہزنوں کے سرخیل" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ ملک خطی اور اس کے لوگوں نے شہنشاہ اور اس کے ساتھیوں کی فراخدلانہ طور پر صحرائی روایات کے شایان شان مہمان نوازی کی اور شہنشاہ کو ذاتی طور پر ایران کی سرحد پار کرائی۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں نے ایک نایاب گراں بہا لعل اور کچھ دیگر قیمتی چیزیں ملک خطی کو تحفہ میں عنایت کیں[2]۔ تمام ہمعصر

---

(۱) ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم۔ اردو ترجمہ از پروفیسر سید حسن ص ۵۶

(۲) ——— ایضاً ———

روایات اور شعری داستانوں سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ بلوچوں نے اس وقت ہمایوں کو فوری اور طاقت ور عسکری کمک دے دی۔ جب انہوں نے ایک حملے میں سوریوں سے دہلی کا تخت و تاج دوبارہ حاصل کر لیا۔ روایت ہے کہ میر شہداد رند کی قیادت اور کمان میں شکاہ، ناھڑ اور گگ قبائل کے علاوہ چالیس ہزار رند اور دودائیوں نے ہمایوں کی حمایت میں کمر بستہ ہو کر اس کی طاقت و قوت میں اضافہ کیا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امیر چاکر کی بہن آزاد منش اور بہادر خاتون [illegible] کی قیادت میں رند شہسواروں کے ایک دستے نے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ میر شہداد اپنی نظم میں بیان کرتا ہے :-

"بھوری رنگت کی گھوڑیوں کے شہسواروں کی بندوقوں کی گولیوں سے جنگ کا آغاز ہوا۔ ساعت بھر کی تاخیر نہیں ہوئی، ایک ہی لمحے میں پانی دودھ میں تبدیل ہونے لگا۔ جب میں نے اپنی قدح جیسی آنکھوں سے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ میری جانب کی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں۔ تمام سیخی بجھانے والے میر عالی رند کا جوش ٹوٹ کر جاگ کھڑے ہوئے اور میر کو تنہا میدان میں چھوڑ دیا تھا۔ دہلی کے بہادر ترک میدانِ کارزار پر چھا گئے۔ ادھر شیہک کی دختر مائی بانڑی میدانِ کارزار میں ڈٹ گئی۔ یہ دیکھ بہادر رند جانبازوں نے یلغار کر کے ہلہ بول دیا۔ دہلی کے غضبناک ترکوں نے پیٹھ دکھائی۔ اصیل گھوڑیوں کے شہسوار رند تلوار کے جوہر دکھا کر سرفراز ہوئے۔ دہلی کے حرام خور ترکوں نے فرار میں پناہ لی اور کوہستان کے بلوچوں کے سامنے سرمار ہو گئے۔"(۱)

---

(۱) بلوچوں کی مقبول عام شاعری (POPULAR POETRY OF BABIEHES)
از لانگ ورتھ ڈیمز صہ۳۲

میر شہداد کے آٹھ بیٹے اسس لڑائی میں کام آئے ۔ وہ اپنی نظم میں اظہار کرتا ہے کہ اس نے بلوچ جنگبازوں کے ساتھ سب سے پہلے دہلی کے قلعے میں داخل ہو کر آٹھ روز تک اس پر قبضہ جمائے رکھا۔ اسس کے بہادر ساتھیوں نے تاریخی دارالسلطنت میں فتح و نصرت کے جشن منائے ۔ مذکورہ بالا بیان پر شک و شبہ اور ردو قدح کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ بلوچ سوریوں کی بادشاہت اور فرمانروائی کے کٹر مخالف اور باغی تھے۔ ان کی تمام ہمدردیاں مغل بادشاہوں کے ساتھ تھیں ہمایوں دہلی لوٹتے ہوئے دھن کوٹ ، بھیرہ اور خوشاب سے گزرا تھا۔ ان مقامات پر بلوچوں کی کثیر آبادی تھی ۔شہنشاہ نے ان مقامات پر قیام کیا اور اس وقت کا انتظار کیا جب اس کو حلیف میسر آسکیں، تاکہ ان کی تلواریں اسس کے کام آئیں۔ دہلی کی فتح کے بعد رندوں کے ہزاروں خاندان دارالسلطنت کے مضافات میں آباد ہوگئے، اور بعد ازاں کئی ان میں سے آگرہ کی جانب منتقل ہو گئے۔ جہاں انہوں نے ایک بستی بسائی جو آج تک "بلوچ پورہ" کے نام سے مشہور ہے اور وہ سب اپنے آپ کو رند بلوچ کہتے ہیں ۔ اور فخر و مباہات کے طور پر اظہار کرتے ہیں کہ وہ شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ جاکر کی وفات کے بعد، ہم صوبہ ملتان میں تمام بلوچوں کو، بعد کے مغل حکمرانوں کے خلاف صف آرا اور بغاوت پر کمربستہ پاتے ہیں، انہوں نے کئی بار، اکبر کی قوت و طاقت کو للکارا جس نے بالآخر ڈیرہ جات کے بلوچوں کی قوت کو کچلنے کے لئے مغل فوج بھیج دی۔[1]

---

(1) "THE HISTORY OF ARYAN RULE IN INDIA FROM THE EARLIEST TIMES OF THE DEATH OF A AKBAR"

(از منہ قدیم سے اکبر کی وفات تک ہندوستان میں آریاؤں کی حکومت کی تاریخ) از

ایک دوسرے موقع پر اکبر نے خان جہان کے بھائی، اسماعیل خان کو سندھ اور بلوچستان کے علاقوں کو بزورِ شمشیر اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کرنے کی غرض لشکر دے کر روانہ کیا۔ مغل سپہ سالار ہولناک طور پر بلوچی علاقوں میں اندر ہو گیا۔ بلوچ سرداروں غازی خان اور ابراہیم خان نے اس کی سخت مزاحمت کی اس معرکہ آرائی کے دوران میں انہوں نے پیش ہو کر اپنے کو اس کے حوالے کیا انہیں دربار میں پیش کیا گیا۔ شہنشاہ نے اعزاز و اکرام کے ساتھ انہیں بحال اور انہیں اپنا علاقہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ بلوچوں کی پیدا کردہ بدامنی افراتفری، اور نفسا نفسی نے شہنشاہ شاہ جہان کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ وہ ملتان صوبہ اور ما تحت علاقوں کے انتظامی معاملات کی نگرانی اپنے بیٹے شہزادہ اورنگزیب کے سپرد کر دے (۱)۔ سنہ ۱۱۰۰ ہجری میں اورنگزیب نے پریشان سرکش بلوچوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر روانہ کیا (۲)۔

ملتان پر بلوچوں کا قبضہ:

دہلی کی بادشاہت کے سنہ ۱۵۲۵ء تا ۱۵۵۵ء کے درمیانی تیس (۳۰) سال کئی خاندانوں کی فرماں روائی کے عروج و زوال کے ڈرامائی منظر کے مظہر ہیں۔

ایچ بی ہاول (H-B-HOVEIL) صفحہ ۵۲۱

(۱) آئین اکبری مترجم بلاچ مین (BLOCHMANN) صفحہ ۳۶۱۔

واقعات عالمگیری، مرتبہ سید نجیب اشرف جلد اول صفحہ ۱۱-۲۹۔

(۲) منتخب اللباب از محمد ہاشم خان، موسوم خافی خان جلد دوم صفحہ ۳۴۴۔

۱۵۲۶ء میں بابر بادشاہ نے لودھی سلطنت کا تختہ الٹ کر ہندوستان میں مغل شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔ ۱۵۳۹ء میں شہنشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے شکست دی اور اسے دیس سے نکال باہر کیا۔ اس طرح سوری خاندان اقتدار اعلیٰ کی مسند پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے لگا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے تخت دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے سوری پٹھانوں کی تقدیر پلٹ دی۔ اس پر آشوب اور ہیجان خیز دور میں ہندوستان کے تمام دور افتادہ صوبوں کے والی، مشکوک وفاداریوں اور حقارت آمیز اعتماد کے ساتھ ہر اس فرمان روا کے احکامات بجا لاتے تھے جو عصائے شاہی پر اپنا قبضہ جماتا۔

تقدیر نے بلوچوں کے عظیم رزمیہ ہیرو امیر چاکر کو پہلے ہی کافی زک پہنچائی تھی۔ جو اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا۔ مگر بیرونی طور پر بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ضرورت دیارِ غیر میں اس کی شاندار زندگی اور عظمت کی بحالی میں یاوری کر رہی ہے۔ اس کے مدبرانہ اقدامات اور اس کی قوت نے ایک بار پھر اسے روح العصر ثابت کر دیا۔ پنجاب کے بلوچ اس کے تابع اور فرمان بردار تھے اور تمام بلوچ امرا اس کے اشارۂ چشم و ابرو اور لبوں کی مسکراہٹ کے منتظر رہتے تھے ہندوستان میں سوری خاندان کے دورِ حکومت میں، ملتان اور اس کے ماتحت علاقے، شورش پسند اور ضرر رساں قوتوں کی افواج کے زیر نگین و تابع تھے اور اکثر سرکش بلوچوں کے قدموں تلے جہنم زار بن چکے تھے، جس کی نظیر ہمعصر حکمرانوں کی تاریخ میں مفقود تھی۔ بلوچوں نے متواتر پنجاب کے خلاف اپنی تلواروں کے جوہر دکھائے اور اپنے خون سے زمین کو لالہ زار بنا دیا۔ ملتان کا تاریخی شہر تقدیر اور بلوچوں کے لئے شکار کا پرکشش پھندا تھا۔ چاکر اپنی ایک نظم میں اس امر کا اظہار یوں کرتا ہے "ملتان ہر بلوچ کے لئے آسان شکار ہے" ان کے ہاتھوں

لوگوں کو جن مصائب و آلام اور آفات کا سامنا کرنا پڑا، وہ خون آشام معرکوں اور محاصروں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تکلیف و پریشانی کے باعث تھے۔ ہر فرد پر اس کی دولت اور خوشحالی کے لحاظ سے اسی قدر زیادہ خوف و دہشت طاری رہتی تھی۔ پنجاب میں بلوچ لٹیروں اور رہزنوں کی حیثیت سے رسوائے زمانہ تھے۔ اس فن میں انہوں نے اپنے کو اتنا طاق اور مشاق ثابت کیا کہ ایک رات وہ کسی قصبے کو خاکستر بنا دیتے تھے اور دوسری صبح اس جگہ کا نام و نشان تک نہ ہوتا وہ لاہور اور دہلی کے درمیانی علاقوں میں سفاکانہ طور پر تاخت و تاراج کرتے اور سنگدلانہ طور پر کشت و خون کا بازار گرم کرتے تھے۔ اس طرح اپنے ظلم و جبر اور قانون شکنی کے کارناموں کی وجہ سے رسوائے زمانہ تھے اور عزت و احترام کی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ دیہاتوں کی تباہی و بربادی اور ان کے مکینوں کے قتل عام کے مشاغل اس وقت تک جاری رہتے۔ جب تک کہ دہلی کے بادشاہ حرکت میں آکر ان کی سختی سے سرکوبی نہ کرتے۔ اپنی نسل اور خاندان کے طاقتور حکمران، شیر شاہ سوری، کو ان بلوچ گروہوں کی نافرمانی اور سرکشی کے انسداد کے لئے سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جو کہ سب بڑے پیمانے پر بغاوت اور انتہائی غداری کے مرتکب تصور کئے جاتے تھے۔ شہنشاہ ہمایوں کے فرار کے بعد، افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں، ملتان صوبہ، وحشت ناک خون خرابے کی المناک تصویر پیش کرتا تھا۔ فتح خان بلوچ نے ملتان کو فتح کر لیا اور اس کے ماتحت علاقوں کے لئے خطرہ بن گیا تھا۔ شیر شاہ سوری نے فتح خان جاٹ کی سرکوبی کے لئے، جس نے مغل دورِ حکومت میں لاہور اور پانی پت کے درمیانی علاقوں میں لوٹ مار مچا رکھی تھی اور فتح خان بلوچ کو دبانے کے لئے، جس کے لوگوں نے پورے علاقے کو تباہی و بربادی اور افلاس کا شکار بنا دیا تھا۔ پنجاب کے

والی ہیبت خان نیازی کو فوری حکم دیا۔ ہیبت خان نے امیر چاکر کے وکیل کو جو ست گڑھ کا حاکم تھا، اپنے آقا (چاکر) کو اپنے لوگوں کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے کہا۔(۱) ہیبت خان نے محکم عزم و یقین کے ساتھ پیش قدمی کی تاکہ وہ اپنے نام و نمود اور حکمرانی میں ایک سنہری کارنامے کا اضافہ کرے۔ اس نے فتح خان بلوچ کا تعاقب کیا۔ جسے امیر چاکر کے امراء میں سے ایک امیر، مندو بلوچ کی اعانت حاصل تھی اور ان کو سخت مقابلے کے بعد شکست دے دی۔ چاکر کے اپنے بیان اس نے جری رند سرفروشوں کا ایک مضبوط لشکر دریا خان رند کی سرکردگی میں فتح خان جاٹ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ دریا خان انتہائی سفاک اور رحم کے لفظ سے ناآشنا تھا، راول کے مقام پر اس کی جاٹ رعنیا کے ساتھ لڑائی ہوئی اور اس کی فوج کے بڑے حصے کو تہہ و تیغ کر کے اسے شکست فاش دی۔ رندوں کے ایک سو چالیس جنگجو اس لڑائی میں مارے گئے۔(۲) شہنشاہ یہ مژدہ سن کر نہایت خوش ہوا کہ ہیبت خان نیازی نے ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کی ہے اور ان کا مکمل قلع قمع کر دیا ہے۔(۳) اور اسے "اعظم ہمایوں" کا لقب عطا کیا۔ تاریخ افغان کا مصنف فتح خان بلوچ کے ہتھیار ڈالنے کے واقعات کا یوں ذکر کرتا ہے۔

---

(۱) تحفہ اکبر شاہی باب سوئم (جو تاریخ شیر شاہی کے نام سے مشہور ہے) انڈیا آفس لائبریری لندن۔ مسودہ نمبر ۲۱۸۔ صـ۹۳، تاریخ داؤدی، برٹش میوزیم مسودہ نمبر کیو، آر۔ صـ۲۰۵

(۲) امیر چاکر رند مذکورہ لڑائی کے واقعات کا ذکر تفصیل کے ساتھ اپنی ایک نظم میں خود کرتا ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو، تاریخ اکبری، اور تاریخ نظام

"رات کے وقت بلوچیانی امیر جس کا نام میدو تھا[1] نے قلعے کو بچانے کی کوشش کی اور دفاعی جنگ لڑی۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ان (بلوچوں) کو صبح کے وقت قیدی بنا لیا گیا۔ میدو کو بخشو بلوچ نے گرفتار کر لیا۔ اور ہیبت خان کے حوالے کر دیا۔ جس نے ملتان شہر اور ماتحت علاقوں پہ قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ اس فتح کی خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ اور اسے اعظم ہمایوں کے خطاب سے نوازا" تاریخ شیر شاہی کے انگریزی ترجمے[2] میں اس واقعہ کا واضح تذکرہ کیا گیا ہے "رات کے وقت ہندو بلوچ[3] تین سو افراد کے ساتھ مٹی کے قلعے سے باہر آیا اور محاصرہ ڈالنے والوں پہ حملہ اول کر بے جگری سے لڑ کر زبردستی کے ساتھ ان کا راستہ روکے رکھا۔ جب صبح ہوئی تو افغانوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ خوبصورت عورتوں کو بلوچوں نے پہلے ہی خود قتل کر دیا تھا۔ باقیوں کو کنیز بنا لیا گیا۔ اور ہندو بلوچ اور بخشو لنگاہ کو قیدی بنا لیا تھا۔ پھر ہیبت خان ملتان شہر میں داخل ہو گیا۔ جسے بلوچوں نے تباہ و برباد اور ویران بنایا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اپنی فتح کی خوشخبری شیر شاہ کو بھیج دی۔ جس نے اسے اعظم ہمایوں کا خطاب دیا" بعد ازاں ہیبت خان نے قیدیوں، فتح خان اور مندو کو سوری فرمان روا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جس نے انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ان کو لاہور میں تختہ دار پہ کھینچ کر موت کے حوالے کیا گیا۔[4]

---

(۱) اصل نام مندو ہے اور میدو نہیں ہے۔ جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے۔

(۲) تاریخ افغان از نعمت اللہ ترجمہ انگریزی از ڈاکٹر ڈورن (DR-DORN)

(۳) مندو بلوچ کو غلط طور پر ہندو بلوچ لکھا گیا ہے۔

(۴) ایلیٹ صفحہ ۲۹۹۔ ایلیٹ نے بھی اسی غلطی کا اعادہ کیا ہے اور مندو کے بجائے ہندو بلوچ لکھا ہے۔

سردار اعظم کے آخری ایام:-

پا کر، شیر شاہ سوری کے زمانے میں اوکاڑہ (پنجاب) کے نزدیک واقع ایک قصبہ ست گڑھ میں آباد ہو گیا تھا۔ اس نے پیرسنی میں اپنی زندگی کو عبادت گزاری اور مراقبے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ مگر اسے زندگی کے آخری ایام تک نبرد آزمائی و معرکہ آرائی سے محبت و انس رہا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ وہ ان زخمات کی تاب نہ لاکر ان جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ جو اسے دو مست بیلوں کو لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ کرنے میں پہنچے تھے۔ آخری دم تک طویل عمر کے بوجھ اور اضمحلال سے وہ خمیدہ نہیں ہوئے اور ان کی صحت و تندرستی قابل رشک تھی ان کی اچھی صحت و تندرستی نے عمر کے تقاضوں کو مات کر دیا تھا۔ اس قابل تعزیز دار الفنا سے اس کے دارالبقا کو کوچ کرنے کی صحیح تاریخ پر ابھی تک تاریکی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے غالباً وہ فاتح اعظم فرشتہ اجل کے ہاتھوں ۔۔۔ جو نصرت و کامرانی کا متنفر اور دہشتناک عدو و حریف ہے۔ ۱۵۵۰ء تا ۱۵۵۵ء کے درمیان لقمۂ اجل بنے ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کی دہلی پر فتح پانے سے کچھ عرصہ قبل اس کے بیٹے میر شہداد نے، جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے، ملتان سے ناہڑ، لنگاہ اور گگھ قبائل سے اتحاد قائم کر لیا تھا۔ ہم ان برسوں کے دوران چاکر کا کوئی ذکر نہیں سنتے۔ جب کہ ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے دوبارہ حصول میں جد و جہد کر رہا تھا۔ اس کی حیات آفرین زندگی کا پیمانہ رفتار زمانہ سے لبریز ہو چکا تھا اور اس کے دن لپیٹے جا چکے تھے۔ وہ اس فانی دنیا سے عز و وقار کے ساتھ دائمی ملک عدم ہو چکا تھا اور ست گڑھ کے قلعے کے اندر ایک خوبصورت پر کشش اور بلند و بالا گنبد نما قبر میں سکون و آرام کی ابدی نیند سونے کے لئے اسے دفن کیا گیا تھا۔ جو اس کی شخصیت

کی عظمت، شان و شکوہ اور سطوت و دبدبے کے شایانِ شان تھی۔ یہاں عظمت، وقار، شان و شوکت اور نیکی و پارسائی کے پیکر بیبرگ کا جسدِ خاکی تمام محاسن و اوصاف کے مجموعے کے ساتھ ایک ہی یادگار میں مدفون ہیں اور یہ یادگار آج بھی موجود ہے۔ مقبرے کی شان و شوکت اور آب و تاب زمانے کے تغیرات سے ماند پڑ چکی ہے۔ جس سے انسان کی کمزوری اور بڑائی میں عدم ثبات نمایاں طور پر عیاں ہوتا ہے۔ بلوچ تاریخ کا عظیم قائد اور بلند کردار ہستی، جس کی پر جوش، ولولہ خیز اور مضطرب روح نے اسے ایرانی بلوچستان کی حدود سے لے کر پنجاب کے قلب تک وسیع و عریض علاقوں کے گوشے گوشے تک سرگرم سفر ہونے اور انہیں پامال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر کار دیارِ غیر میں چند فٹ کی قبر کی جگہ نصیب ہوا۔ وہ اپنی عظمت اور خوبیوں کو اپنے ساتھ لحد میں لے گیا اور اس نے دنیا پر اپنی کوئی تمثیل و نظیر پیچھے باقی نہیں چھوڑی۔ اس کی موت پوری نسل کے لیے ایک ہمہ گیر آفت تھی اور بلوچوں کے لیے ایسا ہی المناک و کربناک سانحہ تھا جو اس سے قبل کبھی رونما ہوا تھا اور نہ ہی بعد ازاں رونما ہوا۔ بلوچ نسل کی عظمت اور قبیلہ مت کی یکجہتی و یگانگت چاکر کی شخصیت کے فنا ہونے کے ساتھ ہی خاک میں مل گئی۔ ٹیمپل اس کے مقبرے کا صحیح محلِ وقوع اس طرح بیان کرتا ہے :۔

"چاکر کا مقبرہ جو ملتان ڈویژن میں مردوسے قبرات ۱۵۸۱-۱۵۸۰ پر محیط ہے۔ لاہور اور ملتان کے درمیان شاہراہ پر سید والا کے بالمقابل دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے اور "تکیہ نواب چاکر" کے نام سے موسوم ہے"۔(۱)

اس طرح بلوچوں کا سردارِ اعظم ان لوگوں کے درمیان ابدی نیند سو رہا ہے۔

---

(۱) پنجاب کی قدیم داستانیں (BGENDS OF THE PANJAB)
از آر۔ سی۔ ٹیمپل

جو اس ہستی کی عظمت اور کارناموں سے ناواقف اور لاعلم ہیں۔ جس نے مصائب و آلام کے باوجود زندگی بھر بے لوث اور مخلصانہ جذبات اور خوش و خروش کے ساتھ اپنی نسل کی عظمت اور شان و شکوہ کے لئے عظیم جدوجہد کی اور جسے ۲۰ ملین بلوچ ابھی دلہانہ جذبات کے ساتھ حب و اخلاص، پیار و محبت اور عزت و تکریم کی نظروں سے یاد کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں روزِ محشر تک اس کی یاد مناتی رہیں گی۔

پنجاب میں چاکر کے خاندان کی براہِ راست نسل، چند پشتوں کے بعد، نیرنگیٔ زمانہ سے معدوم ہو گئی۔ بلوچستان میں ڈومبکی قبیلے کی محرانی، براہمانی اور میروزئی شاخیں، اس شاہی حسب نسب کی علامت کے طور پر موجود ہیں۔

اسس کا کردار:۔

ایک ایسے ماحول اور نظامِ حیات میں، جس میں تجارت و زراعت حقارت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی، تشدد اور لوٹ مار پر بطور عقیدہ ایمان لایا جاتا تھا اور شمشیر کی نوکِ برآں سے قسمت کے دروازے وا ہوتے تھے، اس میں بلوچی مزاج کے خصوصی خصائل، تشکیک، کینہ جوئی، رشک و حسد، بہادری، فیاضی، استقامت، استقلال و فرمان برداری کا جنم لینا ناگزیر تھا۔ جن کی رو سے یہ دنیا خاندان اور قبیلے کے فروغ توسیع کا ایک منظر ہی تھا۔ چاکر اپنی نسل کے سردار کی حیثیت سے، اپنی فطرت اور پرورش و پرداخت کے اعتبار سے، ان دونوں عناصر کی بنا پر، ان تمام خصائل کا پیکر تھا۔ وہ مضبوط و مستحکم فرماں روا تھا اور ایک تربیت یافتہ ماہرِ فنِ حرب تھا۔ اسس کی تربیت و پرورش احسن طریقے سے ہوئی تھی۔ فطرت نے اس کی ذات کے مقابلے میں اس کے ذہن و دماغ کو زیادہ خوبصورت اور دلکش بنا دیا تھا وہ طویل القامت اور ناقابلِ شخصیت کا حامل تھا، اس کا گندمی چہرہ، چیچک کے

چھوٹے چھوٹے نشانات کے ساتھ گھنی داڑھی اور لمبی مونچھوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی دونوں چمکتی عقابی آنکھیں، ناقابلِ تسخیر تنومند ذہن کی فسونشانیوں سے مرصع تھیں اور اس کے ساتھ اس کے چہرے کا غضبناک اور ہیبتناک رنگ، اس کے سخت گیر مزاج سے تطابق رکھتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت اور وضع قطع اس قدر شاہانہ، پرہیبت اور کرخت تھی کہ جس سے سورج کا نظارہ کرنے والی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس کے قلب و دماغ میں ثنوی اور متضاد خصائل کے حامل دستور بجا طور پر رچ بس گئے تھے۔ ایک لمحے میں اس کی گفتگو سے، انسانیت، شفقت، مہربانی اور عدل و انصاف کے فوارے پھوٹتے تھے، جب کہ دوسرے ہی لمحے میں، وہ نفرت، وحشت و بربریت کی تمام حدوں کو پھلانگ جاتا تھا، اس کا طرزِ عمل، سنجیدگی، متانت زہد اور صبر کا مرقع تھا۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھا۔ جس کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہیں ٹپکتے تھے اور عموماً معرکہ آرائی میں مسرت ولذت محسوس کرتا تھا، خصوصاً جب اس کے وقار کا مسئلہ درپیش ہوتا — وہ پر امن طور پر حکمرانی کے بجائے، میدان کارزار کی خونریزی اور سفاکیت کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ذہنی و جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں سے مساوی طور پر سرفراز ہونے کی بناء پر میدانِ جنگ کی مانند اپنے دربار میں بھی پر جلال ہوتا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ عقل و دانش، غیر جانبداری، پرتاثیر، ترغیب و شیریں دہن سے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ اس کی زندگی عہد سے لے کر لحد تک تنازعات اور مصائب کی آئینہ دار تھی اور اوائلِ شباب سے ہی وہ رزم آرائی دستیزہ کاری کا خوگر تھا۔ کوہستان قلات کی برفانی چوٹیوں سے لے کر سبی اور کچھی کے آتش کدہ میدانوں تک اس کی متواتر اور مستقل پیش قدمیوں اور سفروں سے، زمانۂ نوجوانی میں اس کی قوتِ برداشت، صبر و تحمل اور عزمِ صمیم کی عکاسی ہوتی ہے وہ ایک ایسی ارفع قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ جو غیر معمولی ثابت قدمی اولوالعزمی اور ہمت و حوصلے سے جلا پاتی تھی، اس کی

ذاتی اور تجارت سے ہرگز بے تعلق رہا تھا۔ اس کے ضابطۂ اخلاق میں غرور و انا مفقود تھی۔ وہ ظاہری نام و نمود اور مجرد شان و شوکت اور نمائش سے پاک و منزہ ہو کر لباس اور پوشاک کے معاملے میں سادگی پسند تھا اور خورد و نوش کے سلسلے میں انتہائی کفایت شعاری اور سادگی سے کام لیتا تھا۔ البتہ اسے اپنے خاندان اور اپنے خون اور نسل کے ننگ و ناموس اور عزت و وقار سے والہانہ محبت تھی اور جو بھی دستورِ حیات اور ضابطۂ اخلاق کی سختی سے پیروی کرتا تھا وہ سب لوگوں کو اس ضمن میں اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے آمادہ و مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے فریضہ، اپنی ناموری اور شان و شکوہ کی خاطر متحرک اور دائم سرگرمِ عمل رہتا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے کبھی کوئی ایسا اقدام روا نہیں رکھا جو اس کے اپنے خون اپنی نسل اور اپنے دشمنوں کی بے عزتی، بے حرمتی اور ذلت پر منتج ہو اور یہی روح اس نے اپنے لوگوں میں بھی پھونک دی تھی۔ ان میں یہی جذبات ابھارے تھے۔ کسی نازک بحران اور آشوب کے زمانے میں اس کی خاموش طبعی صبر و تحمل، بردباری، مروت، رواداری اور دیانت داری سب کے لئے قابلِ رشک ہوتی تھی۔ وسیع القلبی اور کشادہ نظری اس کے طرزِ عمل اور کردار کا طرۂ امتیاز تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مسلمہ اعدا و حریفوں کے ساتھ بھی اس حد تک خندہ پیشانی اور عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا تھا کہ اس کے مخالفوں اور دشمنوں کو بھی اس کی تعریف و تحسین کرنی پڑتی تھی۔

ایک منتظم کی حیثیت سے:-

اب ہم اپنے بطلِ جلیل اور ہیرو کی زندگی کے کمزور ترین و تاریک ترین پہلو کا جائزہ پیش کریں گے۔ وہ ایک منتظم اور ایک سیاستدان دونوں

حیثیتوں سے انتہائی ناکام رہا۔ سیاستدانی اور مدبری کے خصائل کا فقدان وہ خامی ہے جس سے اس کی جدوجہد سے بھرپور جفاکش زندگی کی تابندگی اور درخشندگی ماند پڑ جاتی ہے اور اس کی زندگی داغدار ہوتی ہے۔ اس سے اس کی عظمت و شہرت پر تاریکی کے دبیز پردے دائمی طور پر پڑے رہے۔ انتظامیہ اور نظم و نسق اس کے فرائض منصبی کا جزو نہ تھے۔ اس کا فریضہ فقط اس قدر تھا کہ وہ کسی علاقے کو فتح کر کے اسے مفتوح کے رحم و کرم پر چھوڑ جائے۔ وہ تعمیر کے نشہ میں مست و سرشار تھا۔ مگر اس کے ثمرات سے بے نیاز رہتا تھا۔ جونہی وہ کسی علاقے کو فتح کرتا تھا وہ اسے کسی سر بریدہ لاش کی طرح چھوڑ کر اس سے غافل ہو جاتا۔ مکران سے لے کر سبی تک وہ قبیلوں پہ قبیلوں کو مطیع و تابع دار بناتا گیا۔ مگر اس نے کسی مستقل حکومت کے قیام کی خاطر کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں کی۔ اس کی فرمان روائی اس کے شمشیر زنوں کی مرہون منت تھی جو اپنے زمانے کے نہایت تجربہ کار اور لائق و فائق افراد تھے۔ اس کی حکومت تیغ زنی اور شہسواری تک محدود تھی یا دیگر واضح الفاظ میں، تلواروں کی باہمی آویزش اور جھنکار میں ہی اس کی حکومت تھی۔ وہ ایک ہی یورش اور شہسواروں کی ایک ہی یلغار کے دوران کئی گئی گنگھوں کو فتح کر کے ان کو اس کے اسی حال پر چھوڑ کر آگے بڑھتا گیا۔ اس نے ایک طوفانِ بلاخیز کی صورت میں پورے بلوچستان کو اپنی لپیٹ میں لے کر روند ڈالا اور کسی بھوت پریت کی مانند پھر منظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس میں مدبری کے فقدان کے باعث پوری نسل، اتحاد کی نعمت سے محروم رہی جو کہ قوت و طاقت کی مضبوط بنیاد ہوا کرتی ہے۔ بلوچوں کے سیاسی و سماجی ڈھانچے کا معمار اس کے مرکزی ایوانِ اقتدار کو ایک آہنی قالب فراہم کرنے میں انتہائی غفلت کا مرتکب ہوا۔ اگر اس میں مدبری اور سیاستدانی کی بصیرت کی رمق ہوتی

تو معمولی محبت و پیار سے وہ اپنے لیے ایک وسیع آزاد اور خود مختار مملکت کی داغ بیل ڈالتا اور تاریخ میں شہرت و دوام کا حامل ہوتا۔ اس کے بے نظیر بلوچ جیالوں اور سرفروشوں کے ہاتھوں اس دور میں سندھ اور ملتان صوبوں کی فتح، جو اس وقت کمزور حکمرانوں کے قبضے میں تھے۔ صرف معمولی تحریک اور لمحوں کی بات تھی۔ اس کا لشکرِ جرار، تاریخ کے دو عظیم فاتحین چنگیز اور تیمور کے منگول اور تاتار قبیلوں کے مقابلے میں، جنہوں نے طوفان بن کر مختلف نسلوں اور علاقوں کے بادشاہوں کے تخت و تاج چھین لیے تھے، نفری، تعداد، بہادری اور اسلحہ کے لحاظ سے کسی طرح بھی کم حیثیت کا حامل نہیں تھا۔

اس نے تقریباً تیس سال تک فرسودہ جاگیرداری رواج کے مطابق حکمرانی کی۔ جہاں قانون غیر واضح ہو اور باوثوق نہ ہو، وہاں قانون خود عنقا ہوتا ہے۔ تلوار اور طاقت کا قطعی راج تھا۔ تشدد اور ہنگامہ پروری کی حالت عمومی تھی۔ اس نے مفتوحہ علاقوں کو مختلف قبائل پر ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم کر دیا۔ قبائل کی قوت اور عزت و وقار کا طائرانہ تخمینہ اس بنیاد پر لگایا جاتا تھا کہ ان کی لڑنے والی نفری کتنی ہے اور کس قدر اس کی چراگاہی دولت کو مدِنظر رکھا جاتا تھا۔(۱) اس وقت

---

(۱) ہم سولہویں صدی عیسوی کے کسی بلوچ قبیلے کی چراگاہی دولت کا واضح اندازہ ایک نظم سے لگا سکتے ہیں۔ نل کی تاریخی جنگ سے چند روز پیشتر کچھ لاشاری خاندانوں نے زرعانی بلوچوں کے ہاں پناہ لی جنہوں نے دعوت کے طور پر اپنے مہمان لاشاریوں کو ۵۰۰ من گندم، ۹۰۰ بیل اور ۸۰۰ مویشی دے دیئے۔

ملاحظہ ہو۔ پاپولر پوئٹری آف بلوچیز از لانگ ورتھ ڈیمز

کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔ نظریاتی طور پر ہر قبیلے کے قدیم رسوم ورواج کے مطابق عدل و انصاف کیا جاتا تھا۔ مگر عملی طور پر سردارِ اعظم کا فیصلہ صائب وحتمی ہوتا تھا۔ اس کی رائے کو قانون کا درجہ حاصل تھا، خون کا بدلہ خون تھا۔ انتقام گیری ان کے لئے زندگی کی تقریباً لازمی ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسی روح فرسا پیاس تھی۔ جسے خون کے بغیر کوئی دوسری شے بجھا نہیں سکتی تھی۔ ابتدا میں سیاہ کاری کے معاملات و مقدمات قرآنی و شرعی تعلیمات کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ لیکن بعد ازاں زنا کے مرتکب دونوں افراد یعنی زانی اور سیاہ کارہ کو قتل کی سزا دی جاتی تھی۔

کچھ معاملات میں جب مستغاث علیہ ایک سخت مجرم نکلتا تو ایک بھونڈے اور توہمات سے بھرپور رسومات کے نظام کے ذریعے، انصاف کے تقاضوں کو روبہ عمل لایا جاتا۔ اس پر ایک کڑی جسمانی آزمائش کے ذریعے مقدمہ چلایا جاتا۔ جیسا کہ قرونِ وسطیٰ کے کچھ ایشیائی اور اطالوی قبائل میں عام رواج تھا۔ اس قسم کی دو کڑی آزمائشیں عام تھیں۔ کھولتا ہوا پانی یا تپا ہوا لوہا یا ٹھنڈا پانی۔! ایک شخص جو روحانی قوت کا حامل متصور ہوتا تھا، گرم پانی یا تپے ہوئے لوہے پر، اللہ ذوالجلال کے کچھ اسرار و رموز پڑھ کر دم پھونکتا تھا اور ملزم کو اپنا ہاتھ ابلتے ہوئے گرم پانی کے برتن میں ڈالنا ہوتا، یا تپے ہوئے گرم لوہے کو اپنے ہاتھوں سے چھونا پڑتا۔ اگر اس کا ہاتھ جل جاتا تو وہ مجرم ثابت ہوتا۔ بصورت دیگر وہ بے گناہ تصور کیا جاتا دوسری قسم کی آزمائش میں ملزم کو پانی کے کسی چشمے یا ندی میں پھینکا جاتا۔ اگر وہ پانی کے اوپر تیرتا تو مجرم سمجھا جاتا اور اگر ڈوب جاتا تو معصوم خیال کیا جاتا۔

شاعر کی حیثیت سے:۔

شاعری سولھویں صدی عیسوی کے بلوچوں کا سب سے بڑا اور محبوب

شوق اور مرغوب مشغلہ تھا اور ادبی اظہارِ بیان کا پسندیدہ ذریعہ تھا، چاکر کا دور رزمیہ اور رومانوی شاعری کے کلاسیکی دور کے طور پر عموماً مشہور ہے اور نظمیں خصوصاً بیانیہ اسلوب اور انداز کی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی ڈرامائی انداز بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ اس دور کی تمام کاوشیں اور شاہکار، مختلف واقعات اور رومانوں کے ہیروؤں کے کہے ہوئے کلام کی شکل میں ابھی تک اچھی طرح سے محفوظ ہیں، کلاسیکی شاعری میں سادہ خیالات اور فکر و تخیل کی بلندیاں پائی جاتی ہیں اور ہم اس میں بے جا خوش آمد، قصیدہ خوانی، آورد، مبالغہ آرائی اور دانش فروشانہ لفاظی اور زورِ بیان کے بجائے، زیادہ تر حقائق اور وقائع کی شاعرانہ روح، رواں اور کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ دورِ شجاعت و بہادری اور جنگجو امراء کی خاندانی تواریخ، سوانح اور کارناموں کو منظوم کرنے کا دور تھا۔ اس لئے صرف حقیقتوں کو بلند و ارفع شاعری کا جامہ پہنایا گیا بلوچی شاعری ہمیشہ مروجہ دانشورانہ رسوم کی قیود و پابندیوں سے آزاد رہی ہے۔ قلب و دماغ میں بہادری کے جذبات کی لب ریزی کے باعث بلوچ شاعر بھی ہمیشہ شاعرانہ اظہار بیان میں بے خوف و بے باک رہا ہے اور ٹھوس حقائق کو رواں شاعری کے قالب میں سمویا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ کس قدر اعلیٰ فنی بصیرت و صلاحیتوں کے مالک رہے ہیں۔ جنہوں نے اپنے قدیم سامی اجداد سے خوش کلامی کی تخلیقی صلاحیتیں ورثے میں حاصل کی تھیں۔ اس عہد کا سب سے بڑا شوق و جنون انتقام پر مبنی تھا۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا۔ جس میں لوگ جانبازی، شجاعت اور مہمان نوازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہوتے تھے، جائز و ناجائز اور صداقت و کذب میں امتیاز و تفریق یا تو ہتھیاروں کی طاقت و قوت کے بل پر ہوتی تھی یا شاعروں کی تلخ نوائی سے ——— اس عہد کی بلوچی شاعری اس نسل کا عوامی دفتر ہوا

کرتی تھی۔ اسے منفرد مقام اور خصوصی قدر و منزلت اس لئے کہ ان کے کارنامے
باعث حاصل تھی کہ اس کے جلال و جمال کی جانب ہے۔ جنگوں، بہادری، انتقام
گیری، فیاضی اور عشق و محبت کی داستانیں اور واقعات اس دور کی شاعری
کے بنیادی مضامین و مقاصد ہوتے تھے۔ اس عہد کی تمام شاعری کی بنیاد
شوق و ذوق، محبت و اخلاص، مستی، صداقت، معرفت، محبت و ...
تقدیس اور تعجب و درد کی ... کرنے والے ... جذبات کے ساتھ
در تھیں۔ نسل در نسل اور انسان در انسان، موسیقی، مغنیوں اور پیشہ ور ڈوموں نے
حفظ کر کے دستبرد زمانہ سے محفوظ رکھا ہے جو کہ قبائلی قدیم شاعری کے ذخائر
و خزانے کے ... ہیں اور آج تک ان کے ... ہیں۔(۱)

چاکر خود ایک بلند مرتبہ اور اعلیٰ پائے کا شاعر تھا اور کہنے کی سادہ اور
اچھی نظمیں کہی ہیں۔ جو کہ بنیادی طور پر رزمیہ اور جانبازانہ اسلوب کی ہیں

---

(۱) بڑی شاعر اسے نامناسب بلکہ معیوب تصور کرتا ہے کہ وہ اپنی منظومات اور
اپنے کلام کو عام مجمع میں خود سنائے یا گائے۔ اس لئے ایک شاعر جو اپنے کلام
و گفتہ کو عام کرنے کا خواہشمند و شوقین ہو، تو وہ کسی ڈوم کی خدمات کا
متلاشی ہوتا ہے۔ جو کہ اس فن کا ایک فرد ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے
اشعار کو ازبر کراتا ہے۔ افغانوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مغنی یا ڈوم خود شاعر
ہوتے ہیں اور سنانے والے بھی۔

(۲) ملاحظہ ہو۔ جے ڈارمسٹیٹر (J. DARMESTETER) کی کتاب
(CHANT DES AFGHANS) مطبوعہ پیرس (۱۸۸۸-۱۸۹۰ء) صفحہ

اس میدان میں اس کی اہمیت اور شہرت کے بارے میں تمام ہمعصر اہلِ فن اور دانشمند ہستیوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ زندگی کے شائستہ سلیقوں اور تہذیبی اقدار کے پرخلوص اظہار کے ساتھ ساتھ، وہ شاعرانہ خیالات کے اظہار میں نہایت صاف گو اور صداقت پرست تھا اور اس طرح اس نے صرف صداقت کو اشعار کا روپ بخشا، نہ کہ شاعرانہ تعلی سے کام لیا۔ ہم یہاں اس کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ جس کا متن رانگ ورتھ ڈیمز نے جمع کر کے انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کیا ہے۔

" چاکر ابن شیہک نغمہ سرا ہوتا ہے، رندوں کا طاقتور سلطان شعر گاتا ہے، وہ سبھی کو الوداع کہنے کے روز نغمہ الاپتا ہے، میں آدم خور سبھی کو الوداع کہہ کر چھوڑ دوں گا، میرے کافر دشمنوں پر عذاب نازل ہو۔! جام نندہ جبی ٹو کو تین روز روٹیوں کی خیرات کرنے دو۔ ہم تیس سال تک زندگی بھر اپنے جیالے ساتھیوں کے ساتھ لڑتے رہیں گے۔ میری تلوار خون سے زنگ آلود ہو جائے گی اور وہ کمان کی طرح خمدار ہو کر نیام میں نہیں سما سکے گی۔ جیالے عالی نسب نوجوان جو وہ دو پگڑیاں سروں پر باندھتے تھے۔ اب اپنے بہادر والدین کے سایۂ شفقت میں، اپنے خیموں کی چھاؤں میں کھیل اور تفریح کے لئے پھر جنم نہیں لے سکتے۔! نہ ہی وہ اپنی مونچھوں کو معطر کر سکتے ہیں، نہ ہی وہ فربہ مینڈھوں کے لذیذ گوشت سے لذت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اپنی بھٹیوں میں نشاط انگیز شراب کشید کر سکتے ہیں ——— ! اب ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں جو حکمرانی کے خصائل کے حامل تھے — انہیں ہندی تلواروں کی تیز دھاروں نے کاٹ کھایا ہے۔ ان کی بڑی تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ انہوں نے ان کو بیویوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور وہ اپنے ہاتھوں میں بچوں کی لاٹھیاں لئے پھرتے ہیں۔

ایک پتھر جو سمندر میں پھینکا جاتا ——— گہرام غبار آلود گنداوہ میں ہے

ہے! ان تیروں نے اس کا خون پی لیا ہے۔ عالی اور وفا، اس کے کیٹر

حریف کا قلعہ ویران ہو چکا ہے۔ اسے ——— دونوں کے گلے پر قابض ہیں

سفاک ترکوں اور اعلیٰ نسل کی گھوڑیوں کے شہسوار رندوں نے خاکستر بنا دیا ہے

گہرام نے دونوں جگہیں گنوا دی ہیں، اسے نہ تو گنداوہ نصیب ہوا، اور نہ ہی قبر

نصیب ہوئی۔ (۱)

اس کی شخصیت:-

یہ میر چاکر کی خوش قسمتی تھی کہ اس اہلِ خاندان، اول سے لے کر آخر تک اپنی اصل نسل اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے قابلِ تکریم و احترام تھے اور ان کی عالی نسبی مشہور تھی۔ ان کی قابلِ رشک حد تک تعظیم و فرمان برداری کی جاتی تھی۔ اس لئے وہ پیدائش کے وقت سے ہی عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ بنی نوع انسان کا فیصلہ اور رائے عامہ حتمی طور پر سب سے اعلیٰ اور ممتاز رتبہ کسی ہستی کو اس طرح عطا کرتی ہے کہ آئندہ کسی نوعیت کی خامی و کمزوری اور بدنامی و رسوائی کا شائبہ باقی نہ رہے۔ جس کی بناء پر ناکامی و نامرادی کا سدِ باب ہو جاتا ہے، اور پیچھے داغ دھبوں کے کوئی نقوش باقی نہیں رہتے۔ بلکہ اس میں ایک ایسی حیات آفرین روح کی افزائش ہوتی ہے جو مؤثر تحریک و جدوجہد کو پروان چڑھانے پر منتج ہوتی ہے اور لاکھوں انسانوں کے دلوں پر، حتیٰ کہ مصائب و آلام کی گھڑی میں بھی راج کرتی ہے، اور ایسی

---

(۱) پاپولر پوئٹری آف بلوچیز از ڈیمز جلد اول صفحہ ۲۵

شخصیت ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی و تعاون کا مظاہرہ کر کے ان کی آنکھوں کا تارا بن جاتی ہے۔ بلوچوں کا اساطیری ہیرو، اسی قسم کی حیرت انگیز ہستی تھا، اسے اپنے ستاروں، اپنی تقدیر اور قوتِ بازو پر کامل اعتماد تھا اور اپنے طور طریقوں میں ہمیشہ ثابت قدم رہا۔ وہ اس فانی دنیا کے خطرات اور خارزارِ حیات میں اپنی منزل سے کبھی نہیں بھٹکا، بلکہ مخاصمتوں، مزاحمتوں، آشوبوں اور بحرانوں کے منجدھار میں ایک بلند مینارۂ نور کی مانند اس کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی، اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے بے داغ نام و نمود اور عظمت و اجلال کو مردانگی کے ساتھ تالبِ قبر برقرار رکھا۔ تاریخ میں کم افراد نے اپنی ذاتی عزت و تکریم اور وقار و اجلال کے لئے جدوجہد نہیں ہوگی، لیکن بہت ہی کم افراد نے اپنے ملک اور اپنی نسل کے لئے اپنی ذات سے زیادہ بالاتر ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ چاکر کی اہمیت صرف اس کی عسکری عظمت میں مضمر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت اس سے زیادہ اس کی ان گراں بہا کاوشوں سے عیاں ہے۔ جن کی بنا پر اس نے قرنہا قرن سے باہم دست بگریباں اور انتشار و تفریق کے شکار مختلف النوع اور باہم متصادم قبائل کو ایک عظیم نسلی وحدت کی شکل میں متحد و مستحکم کیا۔ اس نے ایک قوی ہیکل دیو کی مانند پورے خطۂ بلوچستان میں اپنے بازو پھیلا کر اپنے ہر کہہ و مہہ کے خون سے اسے لالہ زار بنا کر اس پر اپنا قبضہ و تسلط جمایا۔ اس طرح لاکھوں انسانوں کی تقدیریں محض اس کے چشم و ابرو کے اشارے پر بھینٹ چڑھنے کی منتظر ہوتی تھیں۔ وہ ان ہستیوں میں سے ایک تھا۔ جن کے وجود اس امر کے غماز ہوتے ہیں کہ قدیم ماحول اور وحشی کارزارِ حیات میں بھی، انسانیت کا ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین فروغ پا سکتا ہے۔ وہ ایک بہادر جنگجو، مشاق شمشیر زن، اپنے خیالات میں آزاد منش اور اپنے

عوام کا خیر خواہ، دوست ہونے کے ناطے سے، ایک قابل تعظیم و تکریم جاگیردار سردار کا بلند ترین اور عمدہ معیار تھا۔ ڈیمز تحریر کرتا ہے کہ حالیہ ادبی کتب میں جو ہیرو معیاری سردار خیال کیا جاتا ہے اور جدید داستانوں میں اس کے کارناموں کو معیاری طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر قدیم رزمیہ داستانوں میں اس میں کسی مافوق الفطرت عنصر کی آمیزش نہیں ہے[1]۔ وہ ایک صائب النظر ہستی تھا اور ہمیشہ عظمت و ناموری کی شاہراہ پر گامزن رہتا تھا۔ مگر عز و وقار اور شان و شکوہ کا حامل ہوتے ہوئے، ان کے تمام نتائج و عواقب اور ان کے تلاطم خیز سمندر کی اتھاہ گہرائیوں پر کڑی نگاہ جمائے رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کا ہمدرد تھا۔ اس کے دلیران سے کوئی بالاتر اور بغیر اعزاز و اکرام کے نہیں جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے لوگوں پر اپنا خوف و دبدبہ قائم کیا۔ پھر ان کی محبتیں حاصل کیں اور ہمیشہ اپنی نسل کو چوکس اور کمر بستہ رکھا، کیونکہ اسے لفظوں اور زبانی تکرار کے بجائے کارناموں کی فکر زیادہ دامن گیر اور عزیز تھی۔ اس نے خواہ زمانۂ امن ہو یا حالت جنگ ہو، ہمیشہ اپنی حیثیت اور اپنے وسائل سے تعیشات کی زندگی گزارنے کے بجائے اپنے کو متحرک اور مستعد رکھا۔ اس نے زمانے کے نشیب و فراز کے سامنے بہادری کے ساتھ سینہ سپر ہو کر بہادرانہ طور پر وہ سب کچھ حاصل کیا۔ جس کی اسے تمنا ہوئی تھی وہ زمانے کی ہولناک اور خوفناک نامساعدتوں سے بہادرانہ طور پر نمٹ کر ان کو شکست دینے کا خوگر ہونے کی بنا پر اپنے قول و فعل دونوں میں نابغہ روزگار شخصیت کا حامل تھا۔ اس کی ناقابل شکست شخصیت اور اعلیٰ کردار کے سامنے کبر و نخوت کا شکار بڑی بڑی ہستیاں لرزہ براندام رہا کرتی تھیں۔ اگر

---

(۱) پاپولر پوئٹری آف بلوچیز از ڈیمز ص۳

ہیروازم اور معیاری شخصیت کی حدود بہادری و شجاعت قرار دی جائیں، تو وہ اپنے عصر کے ہیروؤں اور معیاری اعلیٰ شخصیتوں کی صف میں سب سے ممتاز اور بلند نظر آئے گا۔ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک غیر معمولی زندگی اس کے مقدر میں تھی۔ لیکن اس کی شخصیت میں، جبر و کرم وحشیانہ اور جنونی خواہشات اور نفسیاتی قیود و کم آمیزی کا بوقلمون امتزاج اور اس دور کے جاہلانہ اور حد سے متجاوز جذبات کے علاوہ، مشرقی خیالات کی خامیوں کے ساتھ ساتھ بلوچوں کے عمومی مزاج کے خصائل، وہ عوامل ہیں، جو اس کی زندگی کے اسرار نہاں اور ناکامیوں و نامرادیوں کو طشت از بام کرتے ہیں، اس کی تمام زندگی، صرف اس کی شاندار خداداد صلاحیتوں اور اس کی مہمات میں ناکامیوں کے درمیان عجیب تضادات کی موجودگی کی بنا پر ہی قابلِ تحسین و آفرینش نہیں، گو کہ اس کا دور ہنگامہ خیز، واقعات، ہیجان انگیزی، پُر آشوبی، انتشار و تفریق، معرکہ آرائی اور کشمکش سے بھرپور تھا۔ تاہم اس کا دور بلوچوں کی قومی عظمت کا قومی مظہر تھا۔ اس کے بعد بلوچوں کے شان و شکوہ اور نام و نمود کو زوال نصیب ہوا، اور بلوچستان کو اپنے مسائل و مصائب کے کوہ گراں کو سر کرنے اور سخت کدو کاوش اور جد و جہد کے لئے چھوڑ دیا گیا، اس کے بعد کسی کو بھی اس نسل کو تباہی و بربادی، انتشار و تفریق اور زوال و انحطاط سے بچانے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور بلوچوں کی قومی زندگی کی تابندگی اور عظمت دوبارہ بحال نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بلوچ عوام تمام طاقت و اقتدار سے محروم رہے مختلف بلوچ سردار اپنے سابقہ سطوت و دبدبہ کے خاتمے اور برق رفتار زوال پذیری کا صرف نظارہ کرتے رہے، افراتفری، طوائف الملوکی اور انتشار نے اس نسل کو اپنا ہدف بنایا اور ان کی قابلِ رحم حالت زار، قرنہا قرن سے سیاسی بدعنوانی و بدمعاملگی ناچاقی، شخصی مراعات اور عام غربت کے لئے ضرب المثل بن گئی، بلوچ لوگ اس

کے بعد، بلوچستان میں جاگیردار اور زمیندار تو بن گئے، مگر اس کے حکمران نہ بن سکے۔ اور انہوں نے زندگی کا تحقیر آمیز راستہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے فرمانروائی سے احتراز کر کے غیروں اور بیگانوں کے باجگذار بننے کا حلف اٹھا لیا۔ بلوچ بطلِ اعظم، گو کہ اپنی نسل کے انتہا پسند عناصر کو قابو کرنے میں کسی حد تک ناکام رہا۔ لیکن اس نے اپنے پیچھے ایک ابدی پُر افتخار ورثہ باقی چھوڑا اور اس کا نام گرامی ہر پائیدار اور دائمی نوعیت و اہمیت کی مالک شے سے وابستہ و مربوط ہے۔ چار صدیوں کی مدتِ مزید بھی اس کا نام مٹانے میں ناکام رہی ہے اور اس بلوچ گوہرِ نایاب اور دُرِّ یکتا کی آب و تاب اور چمک دمک اب بھی تابندہ و ضوفشاں ہے۔ اس کے حریفوں کے سردار گمنام اور لاشاری اور آئندہ نسلوں کے بلوچ، اس کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ اس کی ذات اور اس کا عہد، ہمیشہ محبوب و پسندیدہ رہے ہیں اور آنے والی نسلوں نے اسے ہمیشہ اپنی آنکھوں کا نور اور تارہ تصور کیا ہے۔ وہ ہستی جس نے اس کو ایک خطۂ ارض عطا کیا، اور اپنی نسل کو بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں لاکھوں میلوں پر محیط وسیع و عریض علاقوں میں پھیلایا، بلوچوں کی تاریخ کی یادگار ہستیوں کی صفِ اول میں سب سے آگے تصور ہوتا رہے گا اور اس کا نام بلوچوں کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کے دفتر میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ کسی نسل اور کسی دور کا کوئی حکمران، اپنی نسل اور اپنی قوم کے لوگوں میں اپنی موت کے بعد اس قدر شہرت اور تحریم و تقدیس کا حامل نہیں رہا ہے۔ جس قدر اس نسل اور خطۂ ارض کے اس بلوچ فرمان روا کو حاصل ہے۔ چاکر کو اپنی زندگی کے مقابلے میں، جب کہ وہ بلوچستان کے تخت و تاج کا مالک تھا، اپنی موت کے بعد، زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور اس کا نام احترام و تقدس

کی علامت بن گیا۔ اس نے جس سنہری ریشے سے بلوچی تاریخ کے ڈھانچے کا تانا بانا بُنا ہے، وہ تا ابد ایک اعلیٰ کارنامے کی یادگار کے طور پر باقی رہے گا اور اس کا عہد فرمان روائی، بلوچوں کی تاریخ کے قرونِ وسطیٰ کی شاندار اور سنہری صدی کے طور پر یاد کیا جاتا رہے گا۔ اس نے ایران کی سرحدات سے لے کر ملتان کی حدود تک علاقوں کو مختلف بلوچ قبائل کے درمیان تقسیم کر کے جس دور اندیشانہ ذہانت و بصیرت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے وہ آنے والی نسلوں اور اخلاف کی تحسین و ستائش اور تکریم و تقدیس کا مستحق ٹھہرتا ہے اور ابھی تک چار صدیاں گزر چکی ہیں۔ مگر یہ علاقے ہنوز خالص بلوچی خطے ہیں۔ مکران سے ملتان تک اس کی پیش قدمی عزم و وقار، طاقت و قوت، عظیم کردار اور مردانگی کی فتح تھی۔ خون کی ندیاں بہا کر مالکیت کے حصول کے بعد، یہ لازم ہے کہ اسی شدت اور سختی کے ساتھ برقرار رکھا جائے، جس طرح کہ اس کا حصول موثر بنایا گیا تھا۔ سینکڑوں اولوالعزم فاتحین نے لاکھوں انسانوں کی لاشوں کا انبار لگا کر آباد اور ترقی یافتہ شہروں کو نذرِ آتش کر کے چشم زدن میں بادشاہوں کو محکوم بنا کر اور مفتوحہ لوگوں کی عزت اور ننگ و ناموس کو خاک میں ملانے کے بعد ان کی تحقیر و تضحیک کر کے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ مگر عام اصول و قواعد اور ایقانی ضوابط کے مطابق ہلکی بوندا باندی تو دیر تک برستی رہتی ہے، جب کہ ناکہانی طوفان کی عمر بالکل مختصر ہوتی ہے۔ جونہی انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں، ان کے جانشینوں کے ہاتھوں زوال و انحطاط کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اور صوبے اور علاقے ان کی سیادت و فرماں برداری سے گریزاں ہو گئے، اس طرح کچھ پشتوں کے بعد ان علاقوں میں ان حکمران خاندانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ جہاں دیوتاؤں کی طرح ان کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ بلوچوں کے غلبہ و تسلط اور آبادکاریوں کے ضمن میں ان کے خوش و جذبہ پر

"قاموس نامۂ اسلام" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) کا ایک اقتباس کچھ روشنی ڈالتا ہے: ان کی کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی، بلکہ ہر قبیلہ ایک سردار کے ماتحت ہوتا تھا۔ اگر ہم قدیم حضری داستانوں پر انحصار کریں تو زمینداروں اور لاشاریوں کے سرداروں کی قیادت میں وہ گاہے گاہے باہمی اتحاد قائم رکھتے تھے یہ ڈھیلی تنظیمیں کسی مستقل بادشاہت کے قیام میں ممد و معاون نہیں ہوئی تھیں ہر قبیلہ اپنے لئے مصروفِ پیکار رہتا تھا اور اکثر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے تھے۔ ان کا ہندوستان پر حملہ، گو کہ اس سے وادی سندھ کی آبادی مکمل طور پر متاثر ہوئی۔ تاریخ میں تقریباً عدم توجہ کا شکار رہ گیا۔ جیسا کہ چنگیز خان تیمور اور نادر شاہ جیسے لوگوں کے حملوں نے آبادی پر کوئی اثرات نہیں چھوڑے مگر ان (بلوچوں) کا حملہ، "تاریخی ڈرامہ میں نمایاں اور جاذبِ نظر حیثیت رکھتا ہے"(۱)

دارالمقام سبی:-

سبی کی تاریخ مستقل تغیر و تبدل اور نشیب و فراز کی تاریخ رہی ہے، جو کہ اس کی خوش حال پر قرب و نواح کے قبائل اور قریبی شہنشاہوں کی حریصانہ

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مرتبہ از
ایم۔ ٹی۔ ایچ۔ ہاٹسما (M-T-H-HOUTSMA)
ٹی۔ ایچ۔ آرنلڈ (T-H-ARNOLD)
آر۔ ہارٹس مین (R-HORSTMAN)
جلد اول صفحہ ۶۳۶۔ مطبوعہ لیڈن ۱۹۱۳ء

نگاہوں کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ از منۂ وسطیٰ سے ہی سبی، فرماں رواؤں کی شاہانہ تقریبات اور ازم آرائیوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ اس شہر کا ایستادہ پرانا قلعہ اس شہر کی عظمت رفتہ اور پرانی سطوت و شکوہ کی واحد یادگار کے طور پر باقی ہے۔ اس تاریخی شہر کے گرد و نواح میں کئی دیہاتوں کے ملبے اور آثار موجود ہیں جو ابھی بالکل ویران اور تباہ شدہ حالت میں بے چراغ ہیں۔ سبی کا سنگ بنیاد بلوچوں کی آمد سے صدیوں قبل رکھا گیا تھا۔ لیکن طاقتور رندوں کے اس پر قابض و متصرف ہونے کے بعد، وہ بلوچوں کی اساطیری مہمات اور کارناموں کا اس حد تک مظہر و محور بن گیا کہ ہنوز اس خطے کے دور افتادہ حصوں میں بھی مغنی اور ڈوم ان کو اچھی طرح یاد کر کے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ تاریخ اور اساطیر دونوں، رندوں کے درخشاں و تابندہ عہد میں ہی سبی کے سب کے زیادہ پر شکوہ دور کی عکاسی کرتی ہیں۔ بلوچوں کا یہ مرکز، بلوچ خانہ بدوش قبائل کے لئے جاذب نظر اور کشش جگہ تھی۔ جہاں انہوں نے پر شکوہ رند امارت کے زیر سایہ، تیس (۳۰) سالوں تک نصرت اور مسرت و انبساط کے ساتھ زندگی گزاری اور شرفاء و امراء کی فیاض طبعی نے مقناطیس کی کشش کی مانند، شعراء، موسیقار اور فنکاروں کو اس مرکزی بلوچ شہر کی جانب مدعو و راغب کیا یہ میر چاکر کے عہد میں ایک حیات پرور اور فعال شہر بن گیا تھا اور اپنی اہمیت اور اپنے اثر و نفوذ میں اوجِ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ یہ شان و شوکت اور عظمت و وقار کا حامل تھا اور پوری بلوچ قلمرو میں، شان و شکوہ، سطوت و دبدبہ خوشحالی و امارت، تجارت، حرفت اور آبادی کے لحاظ سے کسی طرح بھی کم درجہ نہیں رکھتا تھا۔ چاکر کو سبی سے بڑی انیست و الفت تھی اور دمِ آخرین تک اپنی شہرت کے باعث اس شہر کو یاد کیا کرتا تھا، جو کہ اس نے سخت جانفشانی

سے فتح کیا تھا، والہانہ طور پر خلوصِ نیت کے ساتھ اس پر حکومت کی تھی، اور ہوشمندانہ طریقے سے اسے آسانی سے کھو دیا تھا۔ اس کے مرکزی قلعے کو بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔ اور وہ شاہی جشنوں اور تقریبات کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کا مرجع و مرکز بھی رہا ہے۔ رند اپنے مخصوص کردار کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس شہر کے مکین تھے اور یہ شہر مشرقی شان و شکوہ، خستگی، گندگی اور جلال و زوال کا عجیب و غریب امتزاج و مرکب تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شہر، انسانوں کے بجائے دیوؤں کا مسکن اور زاد بوم ہے۔ سولہویں صدی کے عشرہ اول میں جب کہ اس کے بلوچ آقا تعیشات، لہو و لعب، معمول معمول خاندانی جھگڑوں اور خانگی مخاصمتوں کے شکار ہو گئے، سبی انحطاطی و آشوبی حالات و عوامل کی بدولت، اپنی اعلیٰ حیثیت اور جلال و تکریم کے درجے سے محروم ہو گیا۔ پھر تین صدیوں کے بعد اس کے برطانوی آقاؤں نے اس کی سابقہ حیثیت کی بحالی کی سعی رائگاں کی اور اس کے ماضی کی شہرت اور قسمت دوبارہ عود نہ کر سکی۔ اس کی جو سابقہ شوکت و عظمت تھی، وہ معدوم ہو گئی ہے۔ مگر اس کی عظمت پارینہ اور شوکت رفتہ کی جھلک، اس کے تباہ شدہ کھنڈرات اور آثار کی صورت میں ہنوز موجود ہے۔ جو بلوچوں کی گردشِ دوران کے ہدف قلمرو کی بے روح لاش کے کوائف کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

جب رندوں کی خوبیوں کو، تن آسانی اور افراط و اسراف کے غیر موروثی چال چلن اور اطوار، ناچاقی و نااتفاقی اور انحطاط پذیری نے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالا۔ تو سبی ان کی نفرت کا نشانہ بن گیا۔ جو انہیں دل و جان سے عزیز تھا اور ان کی بدبختی، بدخصلتوں، برے اعمال اور زمانہ خواری و خرابی کا باعث بنا۔ جس کو انہوں نے اس کی خراب آب و ہوا، بدروحوں، آشوبوں سے

منسوب کیا۔ اسی معروضے کی روشنی میں انہوں نے اپنے شان وشوکت کے مرکز کو "آدم خور سبی" (مرد لواشین سبی) کا خطاب دیا کہ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے بلوچ بھی، جب اس کی کافی عرصہ پہلے وقوع پذیر ہونے والے المناک دور کی اندوہ گین داستانوں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو اس بدنصیب محشر سماں شہر کے بارے میں ایسے ہی افسوسناک کلمات کا بار بار اظہار کرتے ہیں۔

رند بلوچوں کے کلاسیکی اور نظام فتوّت کے دور کے بانی کی حیثیت سے :-

پندرھویں صدی اور سولہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے، بلوچستان میں تسلط وغلبہ کی تاریخ، اساطیر و داستانوں کے دھندلکوں میں نہاں ہے لیکن رندوں کے خاندان کی قیادت نے، یقیناً بلوچوں کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے اور ساخت و ہیئت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور اسے نہایت متاثر کیا ہے۔ رندوں کی قیادت اور ان کے اثر و نفوذ نے سب سے زیادہ اہم تاریخ کی تعمیر و تشکیل کی، کیونکہ یہ ان ہی کا عہد تھا۔ جب بلوچی روایات و رسومات اپنی اصلی شکل و ہیئت اور مخصوص خصائل کے ساتھ جاری و ساری تھیں۔ اس وقت کے بعد بلوچی روایات اور قواعد و ضوابط نے یونانی دیومالائی سپلیس (PALAS) کی مانند بلوچی اقصائے عالم میں چھاکر ان کو اپنی لپیٹ و گرفت میں لے لیا۔ اور اپنی توانائی و تاثیر سے اپنا روایتی کردار ادا کیا، بلوچوں کی زندگی کے ہر میدان میں رندوں کی برتری اور فرمان روائی کا دورہ اپنے طریق کار اور اثر و نفوذ میں بلوچی تاریخ میں اسی طرح اہمیت اور وقعت کا حامل ہے،

جیسا کہ قدیم یونان میں پیریکلیس، قرونِ وسطیٰ کے اختتام میں نشاۃِ ثانیہ اور جدید زمانے میں صنعتی انقلاب کے ادوار کو حاصل ہے۔ اس نے جدید قبائل کو قبائلی ورثہ کا نقطۂ آغاز فراہم کیا، دوسری سامی نسلوں کی طرح، بلوچ قبائلیت اور روایت پرستی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہی صورت حال اب بھی باقی ہے۔ پورا معاشرہ، قبائلی طبقوں اور گروہوں کے بارِ گران سے قعرِ مذلت میں گھرا ہوا تھا۔ چاکر کے عہدِ حکومت کے دوران نقیبانہ نظام خوتت اور بلوچی ضابطۂ اخلاق کو رندوں نے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ جسے بعد ازاں مستقبل کے قبائل نے تنومند اور موثر بنا کر عروج و کمال کی منزل تک پہنچایا۔ چاکر کے زمانے کے رند پر افتخار اور انانیت پسند تھے۔ وہ عجیب و غریب آہنی لوگ تھے اور ان کے استعجاب خیز نفسیاتی ساخت اور لاثانی خصوصیات تھیں۔ جن کی نظیر بنی نوع انسان کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ وہ آہنی قبیلے کے شجاع ترین لوگ تھے اور آسیبی فطرت کے حامل اور خون خرابہ کے دلدادہ تھے جو شعلہ فشاں رہتے تھے۔ اور میدانِ کارزار میں پانی کی طرح بے دریغ خون بہاتے تھے۔ وہ وحشت و بربریت اور جنگ و جدل کے معرکوں میں خون کے پیاسے ہونے میں مشہور و معروف ہونے کی بنا پر، تقریباً ہر با وسیلہ رند کے ہاتھوں خون سے آلودہ ہو کر حنا رنگ تھے اور شاید کچھ محدود افراد پر اس دعویٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور وہ معصوم ہو سکتے ہیں۔ تمام رندوں کا طبقۂ اشرافیہ، فطرت پرست لوگوں کی طرح دینوی حرص و آز اور طمع و لالچ، سونے کی چمک دمک اور تزک و احتشام کے اس حد تک پرستار تھے کہ ایک دوسرے پر سبقت و برتری حاصل کرنے میں، ان کی کاوشیں اور مساعی، وہم و گماں میں بھی نہیں آ سکتیں، ہر شخص بیرونی عوامل سے متاثر

ہوتا تھا۔ ان کی پوشاک اور وضع قطع، موثر اور دلکش اور ان کی انانیت کی تسکین کا موجب تھی۔ ان کی مونچھیں گھنی، پر شکن، خمدار اور پیچدار ہوتی تھیں اور کالے بالوں کی دو نا تراشیدہ لٹیں کانوں کے پیچھے لٹکی ہوئی ہوتی تھیں۔ مونچھوں اور سر کے بالوں دونوں کو روایتی انداز میں رکھا جاتا تھا، جیسا کہ ان کے کلدانی آباؤ اجداد کا رواج تھا۔ ان کے ابرو زیادہ سرمہ کے استعمال سے مکمل طور پر سیاہ تھے۔ اور ان کے نیچے ان کی بڑی بڑی چمکدار اور پرکشش اور تند و تیز آنکھیں، سونے پہ سہاگہ تھیں، عام طور پر وہ شکل و شباہت میں تنومند اور قوی الجثہ تھے۔ اور مضبوط و قوی پٹھوں کے حامل تھے، مردانہ شان اور مدنی خصائل سے مزین تھے، وہ تلوار، ڈھال اور نیزہ وغیرہ جیسے ہتھیاروں کے علاوہ، اپنی پشت پر ایک بڑا ترکش اور خمدار کمان بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ عموماً پشم کا منقش چغہ (شال) استعمال کرتے، سر پر بڑی سفید پگڑی باندھتے اور پیروں میں لمبے سُرخ جوتے استعمال کرتے تھے۔ ان کی محبوب و مرغوب غذا گوشت کی بھنی ہوا کرتی، جسے بلوچوں کا معدہ بڑی آسانی سے جلد ہضم کرنے کا عادی ہوتا، رند خواتین، دراز قد و قامت اور بادامی رنگت کی ہوتیں۔ بازو اور ٹانگیں متناسب اور متوازن ہوتے، چلنے میں سینہ تان کر سیدھا چلتیں، حسن و جمال کا پیکر ہوتیں، سیمابی مزاج رکھتیں اور پردے کی پابند نہیں تھیں، کثیر الازدواجی کا رواج عام تھا۔ مگر ازدواجی زندگی میں بے وفائی کا رجحان مفقود تھا اور کوئی بھی رند، اسلامی قانون اور تعلیمات کے مطابق بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھتا تھا۔ تاہم اپنے وسائل کی حد تک اور اپنی خواہشات کے مطابق کئی کئی داشتائیں رکھنے کے رواج کا نظام مروج تھا۔ ہر رند اپنے وسائل کے مدِ نظر، ساز و سرود اور

شراب کی قبیح اور ناپسندیدہ محفلیں سجا کر دادِ عیش دینے کا شوقین تھا اور ہر سردار کا گھر، حسن و جمال، عیش و عشرت، مہ جبینوں کے ناز و خرام، بزم کی عشق و محبت اور خواتین کے حیلوں کے لحاظ سے ہورٹس ایڈونیڈیس (HORTES ADONIDES) کے پرستان کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ جس کے مقابلے میں بالی ووڈ کی اہمیت اور چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ تمام جنگی قوانین کی رو سے خواتین مراعات یافتہ طبقہ تصور ہوتی تھیں اور ان پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔

پھر رند سرداروں کے بعد اعلیٰ اور شاندار معیارِ زندگی گزارنے میں مختلف سردار، شرفاء، اور عالی مرتبت ممتاز خاندان کے افراد کا نام آتا ہے۔ بہادر اور امیر کبیر ہستیاں، زندگی کے تعیشات سے جی بھر کر لطف اٹھاتے تھے جبکہ مفلوک الحال لوگ بڑی مشکل سے گزر اوقات کرنے اور روکھی سوکھی روٹی پر قناعت کرنے کے خوگر تھے۔ ہر امیر اپنے پیروکار، سر سے پیر تک مسلح لشکروں کے رعب و دبدبہ کے ذریعے، اپنے اثر و رسوخ اور شان و شوکت میں اضافہ کر کے ایک دوسرے پر سبقت و فوقیت حاصل کرنے میں کوشاں ہوتا تھا۔ عوام الناس اور ہر طبقے کے لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے ان کے جذبات کو ابھارنے اور ان کی تفریح طبع کی خاطر، مختلف قسم کی تفریحی تقریبات منعقد ہوتی تھیں، شکار، گھوڑوں کی دوڑ کے مقابلے اور نیزہ بازی طبقہ اشرافیہ کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ جو اعلیٰ سماجی و سیاسی حیثیت رکھتے تھے، ریاستی تقریبات، قبائلی تہوار، نصرت و مسرت کے موقع پر مظاہرے اور تفریحات بلوچوں کے مرکزی شہر کی زندگی میں چار چاند لگاتی تھیں۔ رندوں کی قیادت کے دور میں شجاعت اور بہادری کا ادارہ بام ثریا تک پہنچا۔

بچپن سے بچوں کو جنگی ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت بخشنے کا بلوچی قبائلی، دستور، ضابطۂ اخلاق اور قبائلی معاشرے کی بنا دپر قوت پذیر پشت با پشت سے خاندانی سرفروشی و جانبازی کے ساسی تصورات، اس ادارے کی نشوونما اور فروغ کا باعث تھے۔ بلوچوں کا نظام ختوّت انتہائی سخت تھا۔ جیسا کہ ہم نے سابقہ باب میں بیان کیا ہے۔ اس کا تقاضا تھا کہ اپنے سردار کی فرمان برداری کی جائے۔ اپنے عہد اور قول و قرار کی پاسداری کی جائے۔ صنف نازک اور بچوں کا تحفظ کیا جائے، فیاضی و فراخدلی برتی جائے۔ خواتین کے احترام اور ان کی تقدیس میں سرمو انحراف نہ کیا جائے اور حتمی طور پر اپنے قبیلے کی عزت، سلامتی اور یکجہتی میں اس کے دشمنوں کے مقابلے میں تن من دھن کی بازی لگائی جائے۔ بلوچستان پر رندوں کی فرمان روائی کا دور انسانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالتا ہے۔ یہ ایک ایسا حیرت انگیز دور تھا جس سے تخیلات کی دنیا پر استعجاب طاری ہوتا ہے، اور سنجیدہ اور متین رائے اور نقطۂ نظر پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ انتہا پسند قسم کے لوگ تھے، بہادری، سخاوت، ایفائے عہد، عشق و رومان اور انتقام گیری کے کارناموں کے مظاہرے، انتہا پسندی کے ساتھ انجام پاتے تھے۔ افسون و حقائق، دونوں کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ تحسین و ستائش کا رنگ دیا جاتا تھا۔ مسرت و انبساط کی ہر تقریب اور عشق محبت کی ہر داستان فوری ردِ عمل کے طور پر باہمی رزم آرائی، تیروں کی بارش اور تلواروں کی جھنکار پر منتج ہوا کرتی تھی۔ یہ دور شوق انانیت، آوارگی و اوباشی، نیکی و بدی اور جلال و انحطاط کا مجموعہ اضداد تھا۔ تمام لوگ ان خصائل میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ و دو میں ہمہ کوشاں ہوتے تھے

ان کے ناموری اور شہرت کے حصول میں سفاکانہ کارنامے انجام دینے سے ہر فرد پر دہشت طاری ہوتی ہے۔ اس عہد کے رند طبقہ اشرافیہ میں سے ہم چند کا تعارف کرائیں گے۔ جنہوں نے بلوچوں کی سنہری تاریخ میں شمسِ تاباں بن کر بلوچی دنیا کو منور کیا اور جن کی زندگیوں نے بلوچی خطے کی سماجی و سیاسی فضا و ماحول اور تہذیب و تمدن اور ان کے کردار پر گہرے اثرات و نقوش باقی چھوڑے ہیں۔

میر بجار پڑ رند اپنے سخت غیض و غضب اور اپنی طویل خشمناک جنگوں کی بنا پر انتہائی مشہور و معروف تھا۔ وہ اپنی بلند ہمتی، اولوالعزمی اور حیران کن آتش مزاجی و خشمگین طبیعت کی وجہ سے، رحم و کرم کے جذبات سے قطعاً عاری تھا۔ انہی خصائل کی بنا پر اس نے کئی جیالے اور بہادر افراد کو وقت سے پہلے اپنی شمشیر برہنہ و برآنی کا شکار بنانا اپنا خونین فریضہ تصور کیا۔ وہ ہمیشہ خون کے بدلے خون بہانے اور لڑائی کے بدلے لڑائی کرنے کو عین فریضۂ حیات سمجھتا تھا۔ اگر وحشت و بربریت اور بے باک و بے خوف بہادری کو عظمت کا معیار قرار دیا جائے تو وہ اس اعزاز کا مستحق قرار پاتا ہے۔ میر ریحان ایک انتظاری اور آتشین صفت جنگجو، انتقام جوئی کا شوقین اور ہر قسم کی بندشوں اور پابندیوں سے مبرّا شخصیت کا مالک تھا اور اپنے تیز رو گھوڑے "شیر سیاہ" اور شمشیر برآں کی وجہ سے مشہورِ زمانہ تھا۔ اور دو بدو مقابلے میں مضبوط سے مضبوط ترین حریف کو پچھاڑنے میں یکتائے روزگار تھا۔ میر عابدو اپنی سنگدل، متلون مزاجی، تنقیدی نظریات، تلخ نوائی اور اپنے قول و قرار کی پاسداری کی خصوصیات کے سبب شہرت رکھتا تھا۔ حسن مولا نغ کبر و نخوت اور بے باکانہ شجاعت کا حامل تھا۔ اس کی رگ رگ میں جذبۂ افتخار رچا بسا تھا، غیض و غضب کی

عالت میں طوفانی مست سمندر کی مانند کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کا جذبۂ انتقام آگ کی مانند فوراً اپنا اثر دکھا کر حریفوں کو خاکستر بنا دیتا تھا اور کسی کی پرواہ کئے بغیر مستقل مزاجی اور استقلال کے ساتھ آمادۂ جنگ ہوتا تھا۔ میر حبیب نام و نمود اور شرافت و نجابت میں مشہور تھا۔ طوفانوں اور آشوبوں کے مقابلے میں آہنی چٹان کی مانند ایستادہ رہتا تھا۔ تیغ زنی اور فنِ حرب کا ماہر تھا، میر جنگ دوست اپنے غیض و غضب میں شیر ببر سے بھی زیادہ وحشتناک اور حالت امن میں بھیڑ سے بھی زیادہ نرم دل اور رحمدل مشہور تھا۔ میر مآن ایک اعلیٰ ظرف کا پُرشجاعت شخص تھا۔ اور موت سے ہمیشہ مردانہ وار آنکھیں ملا کر جینے کا عادی تھا۔ میر پیروز شاہ، جو خوش اخلاقی اور تہذیب و شائستہ روی کا آئینہ دار تھا۔ داد و دہش اور سخاوت میں شاہانہ مزاج رکھتا تھا اور عز و وقار اور امارت و ثروت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ میر منڈو خودداری اور استقامت کیشی کا پیکر تھا خوش مزاجی اور موثر وضع قطع میں ہر دلعزیز تھا، شرافت و نجابت کا عکسِ جمیل تھا۔ وہ ایک ایسی اعلیٰ ہستی تھے کہ اس کے ہاتھ اپنے کسی عزیز یا دشمن کے خون سے آلودہ نہیں تھے۔ میر واہر ایک پرجوش اور انتہائی باکردار دیانتدار شخص تھا۔ وہ خاموش طبع اور شاکر و صابر روح کا مالک تھا۔ جس کی زندگی بامقصد اور پرمعنی تھی اور وہ دوسروں کو عزت و شرف اور عز و وقار بخشنے کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا تھا۔ میر تھمبیر اپنے پرخلوص اخلاق اور خصوصی نوازشات میں ممتاز تھا۔ وہ ایک صاف گو اور راست باز شخص تھا۔ جو تلواروں کے سائے میں بھی اپنی صداقت سے سرشار زبان کو قدغن لگانے سے ناآشنا تھا۔ منافقت، تحریص، خوش آمد اور چاپلوسی کے خصائل اس کے ضمیر میں نہیں تھے اور کسی کے سامنے جھکنے اور دستِ سوال دراز کرنے کو

عار سمجھتا تھا۔ میر آنجبا ایک اعلیٰ منکسر المزاج شخص تھا۔ اس میں قربانی و ایثار کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسے اپنی ذات سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ ان لوگوں سے بھی محبت کرتا تھا جو اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ نیک اور مقدس خیالات سے عموماً رہنمائی حاصل کرتا تھا اور اپنے تدبر، عقل و دانش اور خوش کلامی سے اپنے کٹر دشمنوں کی تلخ و تیز زبانوں کو خاموش کر دیتا تھا۔ میر باہر تمام انسانی خوبیوں کا مرقع تھا اور ایک عالی نسب خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے کسی کا محتاج اور زیر اثر نہیں تھا وہ ایک وسیع النظر اور فراخ دل سردار تھا۔ اور کسی کمزور انسان پر ہاتھ اٹھانا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ وہ نہایت پاکباز اور نیک شخص تھا۔ لوگوں کی نیک دعائیں لیتا اور اسے کوئی بھی بری نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی بدولت کئی بدراہ اور کجرو لوگ، راہِ راست پر آ کر نیکی و طہارت کی زندگی گزارنے لگے۔ میر ہدیہ جو نہایت مذہبی شوق و ذوق رکھتا تھا، خدا ترسی اور نیک سرشتی میں قدرت اس سے زیادہ اس خطۂ ارض پر شاید کسی اور پر اتنی زیادہ مہربان نہیں تھی، جس کی بدولت اسے قابلِ پرستش دیوتا کی حیثیت حاصل تھی۔ میر ہارتی کا اپنے آتش انتقام کی بنا پر احترام کیا جاتا تھا۔ اور سخت دل گردے اور آہنی اعصاب کا مالک تھا اس کی آنکھوں سے عورتوں کی طرح کبھی آنسو نہیں ٹپکتے تھے۔ میر جنگال قوی الجثہ اور دہشت ناک قد و قامت کا حامل ایک فرد تھا اور زور مندی اور جرأت رندانہ میں نامور تھا۔ جو ہر خطرہ اور موت کے منہ میں بلا تامل کود پڑتا تھا اور شیروں کے کچھار میں گھس کر ان کے دل دہلا کر انہیں زچ کر دیتا تھا۔ میر عالی ایک پرشجاعت اور پرشکوہ ہستی تھا۔ اپنے کردار اور خصائل میں ایک بے نظیر پیکر جمیل تھا۔ اس کی فیاضی اور دانشمندی ضرب المثل بن چکی تھی، خوبیوں اور نیکیوں کا حسین

پرتو تھا۔ اور اس کی شخصیت نیک بازی اور بہادری کا مجموعہ تھی، میر ہیبت ایک نڈر، جری اور بے باک سورما اور عزتِ نفس سے سرشار رہتی تھا۔ طوفان کی طرح تند و تیز تھا، اس کا دل، جذبہ خودداری وافتخار اور کبر و نخوت کا مخزن تھا۔ تکبر و تنگ مزاجی اس کی عادت ثانیہ تھی، اس کی پر جلال اور بارعب شخصیت کے سامنے، کسی شخص کو اس پر تنقید و نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میر ابراہیم کی، اس کی تیغ زنی کی بنا پر پرستش کی جاتی تھی۔ اس کے غیض و غضب اور خشمناکی و طاقت کے سامنے، وحشتناک شیر بھی دعوت مبارزت دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے ——— اور عظیم بیوزغ جو بے بہا صلاحیتوں کا گوہر نایاب اور تہذیب و شائستگی کا دریکتا تھا، رندوں کے طبقہ اشرافیہ کی زندگی اور روح رواں تھا اور بلوچی تاریخ میں خداداد صلاحیتوں کی حامل ہستیوں میں سے ایک تھا، وہ اپنی متانت و سنجیدگی، تقدیس و احترام، جاہ و جلال، خوش پوشی و امارت، سخاوت، فراخدلی اور شوکت و سطوت کے لحاظ سے، سب سے سر فہرست تھا۔ وہ صاحب اختیار و اقتدار ہستی تھا اور اعلا ذہانت و فطانت کا امین تھا۔ اس کا لباس نہایت قیمتی زربفت کے سیاہ ریشمی چغہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کی پگڑی کی قیمت، اس کے اپنے بیان کے مطابق ایک نایاب تازی گھوڑے کی قیمت کے مساوی تھی۔ وہ اپنے کو ہیروں اور الماسوں سے مزین نکلس سے سجاتا تھا۔ وہ سنہری موتیوں سے مرصع قبضہ کی تلوار، چاندی کے خنجر، سونے کے رکابوں، چاندی کی زین اور سونے سے صیقل شدہ دھار والے نیزے کے ساز و سامان سے اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ رکھتا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر کیا گیا ہے، میر جاڑو نے اپنے اس قول کو

پورا کرنے کی خاطر کہ "جو میری ڈاڑھی ہاتھ لگا کر چھوئے گا میں اس کی گردن اڑا دوں گا" اپنی تلوار سے اپنے چھوٹے بچے کی گردن اڑا دی اور اس معصوم طفل کو زندگی کی نعمت سے محروم کر دیا۔ اسی طرح شہ مرید کبیر کی جو فطرتاً معصوم اور سادہ تھا اپنی اس منگیتر عاتی سے ہاتھ دھو بیٹھا، جو مسحور کن حسن و جمال اور نازک اندامی میں شاید قدرت کی بہترین تخلیقات میں سے ایک تھی۔ جسے شاید ہی کسی نے دیکھا ہو اور اس کی ایک جھلک بھی مرغِ بسمل بنا دیتی تھی۔ روایت ہے کہ شہ مرید نے ایک روز اپنے گھر کسی تقریب کا اہتمام کیا اور اس وقت کے نامور موسیقار سامعین کی روحانی تسکین اور انہیں محظوظ کرنے کے لئے مدعو تھے موسیقاروں نے اپنے خداداد فن کی پسندیدہ اور دلفریب دھنوں اور سازوں کا مظاہرہ کیا۔ اور دل کو سکون بخش اور نشاط انگیز ساز و سرود کی محفل کے اختتام پر شہ مرید نے عالمِ وجد میں یہ قول دیا کہ اس سے کوئی جو کچھ بھی طلب کرے، وہ اسے بخش دے گا۔ موسیقاروں نے، جا کر کے پہلے سے طے کردہ منصوبے کے مطابق کی محبوبہ عاتی کا مطالبہ و تقاضا کیا، جو اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز و محبوب تھی اور اس کی خوشی و صحبت کے بغیر وہ کسی خوشی و مسرت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس غیر متوقع مطالبہ نے شہ مرید کے دل کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش و ساکت رہا۔ وہ سازش اور شرارت کی تہہ تک پہنچ گیا۔ لیکن اس نے اپنے قول کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی منگیتر ان کو بخش دی۔ جس کے ساتھ جا کر نے عالمِ رسوائی اور عدم اعتماد کی فضا میں شادی رچا لی۔ شہ مرید کی عاتی سے والہانہ اور بے لوث محبت، اسے اپنے وطن سے دور کشاں کشاں دور دراز علاقوں میں لے گئی اور اس کی باقیماندہ زندگی تقریباً اُدھر کٹ گئی۔ تب اس نے اسلام کے دونوں متبرک اور مقدس

شہروں کی زیارت کی۔ حانی کو بھی شہ مرید سے والہانہ محبت تھی اور وہ اس کے فراق کے قرب میں مرغِ بسمل کی مانند تڑپتی رہی، شہ مرید نے تارک الدنیا ہو کر تمام دنیوی آسائشوں سے منہ موڑ لیا۔ اس نے جنونی انسانوں کی حیوانی شروفساد کی زندگی سے دور رہ، کر اپنی زندگی خدائے عزوجل کی عبادت گزاری میں وقف کر دی۔ اور رضائے الٰہی پر مطمئن شاکر اور صابر رہا۔ عشق و محبت تحسین و ستائش کے جذبات کو نغموں کا روپ بخشتی ہے۔ اس یکتائے زمانہ حسن وجمال کی پیکر محبوبہ کی جدائی میں تیس سال تک در در کی خاک چھاننے اور مصائب جھیلنے کے بعد، اس نے اپنی عشقیہ و رومانوی شاعری کے ذریعے اس نازنین کو حیات جاوداں بخشی۔ اس کی نظمیں آج بھی بلوچی شاعری کی جان اور شاہکار تصور ہوتی ہیں، اپنی خدا ترسی، پارسائی اور نیکو کاری کی بدولت شہ مرید کی، ایک خدارسیدہ بزرگ اور ولی کے طور پر پرستش کی جاتی تھی اور آج بھی وہ بلوچوں کے "خضر" کے طور پر مشہور و معروف ہیں۔

میر ہارین نے جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ کیا جا چکا ہے، اپنے قابلِ یادگار اپنے بھائی حسن مولانغ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اپنی تلوار کے جوہر دکھا کر کئی زندگیوں کے چراغ گل کر دیئے۔ وہ اپنے مرحوم بھائی کے جانبازانہ اور اعلیٰ کردار، اس کے جاہ و جلال، اس کے پر وقار وضع قطع، دشمنوں کے مقابلے میں اس کی فتوحات، اس کی موت کے باعث لڑائی اور اس کے قاتلوں کو چن چن کر بیدردی سے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے، تمام تفصیلی حالات کا تذکرہ، سب و شتم اور طنز و تشنیع سے لبریز ایک طویل نظم میں خود بیان کرتا ہے۔

فیاضی و سخاوت رندوں کا جزو ایمان تھا اور ہر فرد اس میدان میں

دوسروں پر سبقت و فوقیت حاصل کرنے کا شوقین و دلدادہ ہوتا تھا۔ ہر رند
سردار کی ناموری اور شہرت کا دارومدار اس کی فیاضی اور اس کے کردار پر ہوتا
تھا۔ ہر شخص کو ان کی ممتاز اور تابناک فیاضی کے موثر جذبات یاد کرتے ہوئے
حیرت ناک خوشی و مسرت کا احساس ہوتا ہے، دنیا کی تاریخ میں بے نظیر
شاندار، فراخدل اور شاہ خرچی میں مشہور زمانہ ہونے کی بنا پر رندوں کا طبقہ
اشرافیہ اپنے چشم و ابرو کے اشاروں سے اجنبی اور غیروں کو بھی بہتے چشمے
بڑی زرخیز اور پیداواری اراضیات کے ساتھ بخش دیتے تھے۔ مال مویشیوں کے
ریوڑوں، گلوں، عمدہ نسل کے اونٹوں، عدیم المثال اصیل گھوڑوں، نایاب تلواروں،
اور زرہ بکتروں کی نوازشات روزمرہ کا معمول تھا اور اس پر کوئی بھی اظہار ناپسندیدگی
اور برہمی نہیں کرتا تھا۔ ان کی وسیع القلبی کے سامنے سونے اور چاندی کی کوئی وقعت
اور ارزش نہیں تھی، تمام مذکورہ بالا شخصیات اور دیگر ہستیاں، لاشاری شرفاً
گہرام، نودبندغ، بیبگر اور رامین کے بشمول ہر لحاظ سے بلوچی تاریخ کی عظیم ہستیاں
اور دیوپیکر شخصیات تھیں، بلوچوں کے اس زمانے کے سیاسی و معاشرتی نظام
کے اس امن و جنگ کے معاملات اور تمام دیگر امور اور فیصلے انہی شاہ خرچ
اور صراف انسانوں کی صوابدید اور نگرانی میں سرانجام پاتے تھے۔ قبائل عام طور پر
اپنی حدود اور صلاحیتوں اور اپنے وسائل کے مطابق ان کی پوری تقلید کرتے تھے۔
رندوں نے نظام فتوت کی تمام خوبیوں سے مرصع اور بھرپور ورثہ اپنے پیچھے باقی
چھوڑا ہے، تاکہ آئندہ مستقبل کی نسلیں ذوق و شوق کے ساتھ انہیں اپنائیں۔
یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخ کی مہربانی نہیں ہے کہ بلوچی تاریخ کی تمام عظیم
عشقیہ داستانیں اور رومان اس عہد کی پیداوار ہیں اور ہر عشقیہ داستان
ڈرامائی اور دلکش مناظر سے اس قدر بھرپور ہے کہ دیدۂ نگاہ کو فرحت و نشاط کی

دعوت دیتی ہے۔ اس زمانے کی تمام عشقیہ داستانوں میں سے تین داستانیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جو غم و الم اور مسرت و انبساط اور شان و شکوہ کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ وہ رومان بیوزغ اور گراں ناز، شہ مرید اور حانی اور شہداد اور ماہناز کی روح پرور داستانیں ہیں۔ میر شہداد کو ماہناز کے ساتھ حجلۂ عروسی میں تقریباً سے کے لیے عیش و نشاط کے دن گزارنے اور مسکراہٹوں کی پُر امن زندگی بسر کرنی نصیب ہوئی۔ مگر بعد ازاں اسے کسی غلط فہمی کی بناء پر طلاق دے دی۔ اور ماہناز نے بعد ازاں ایک قلاش اور محدود وسائل کے حامل شخص سے شادی کر لی۔ اس کے بعد ان کے رشہداد اور ماہناز کے عشق محبت کی داستان کا آغاز ہوا اگر پُر خلوص اور پاک محبت میں عزت و وقار اور تقدیس و پاک دامنی کے معیار کی جستجو کی جائے، تو وہ ماہناز کی پاک و صاف پکی پیکر تمیل کے علاوہ اسے کہیں اور نہیں پایا جا سکتا۔ عشقیہ داستانوں کے مختلف ممتاز کردار، جیسا کہ بیوزغ، میرہان، ریحان، عاجزو، بجار، حسن مولانغ، بارین، شہ مرید، شہ جیلی، قمل ، دوتین اور شہداد وغیرہ سب مشہور و معروف ہستیاں تھیں اور اپنے دور کے معروف سرفروش شاعر تھے۔ ان سب نے اپنے دور زمانے کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اپنے عصر کی تاریخ پر دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔ ان معروف شخصیات کی مثال سرفروشانہ اور شاعرانہ زندگیاں اس امر کی واضح تصویر کشی کرتی ہیں کہ شاعری کا کس طرح سیاسی اور عوامی زندگی سے تعلق و رابطہ قائم تھا۔ اس دور کی سیاسی و معاشرتی فضا، بلوچی کلاسیکی شاعری کی وسیع تخلیق اور اس کے فوری و مؤثر فروغ میں نہایت ہموار، صحتمند اور خوشگوار ماحول فراہم کرنے میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوئی اور یہی کلاسیکی شاعری عہد جدید میں تقلید و تحریک کی باعث ہے۔

رندوں کے دور میں امارت و ثروت اور غیر ذمہ داری کو کلید کی حیثیت حاصل تھی۔ ہر رند اپنی پیدائش کے لحاظ سے طبقۂ امراء کا فرد ہوتا، ذوق و شوق کے لحاظ سے ایک شاعر ہوتا اور کسب و ہنر کے لحاظ سے ایک ماہر تیغ زن ہوتا۔ رند اشرافیہ نے سولہویں صدی کی بلوچی تاریخی داستانوں میں نمایاں اور تابندہ کردار ادا کیا اور اپنی شقاوت قلبی اور ظالمانہ طریق کار کے باوجود انہوں نے بلوچ معاشرہ میں عزتِ نفس خود داری اور عز و وقار کی روح پھونک دی اور قبائل اور افراد کے درمیان، باہمی فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کیا۔ اس لئے انہیں تا حال عظیم الشان بلوچی کردار، رسم و رواج، فکر و تخیل اور اصول و ضوابط اور چار صدیوں کی پرانی فراموش کردہ مستحکم حکومت کی طاقت اور شوکت کے ساتھ اپنے اساطیری ماضی کا حسنِ مجسم اور اکمل ترین تمثیل تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مستقبل کی نسلوں کے لئے ایک مستقل اور پائیدار ضابطۂ اخلاق مرتب کیا اور جدید ترقی یافتہ اور فلسفیانہ دور بھی، رند زعماء اور ہیروؤں کے اعزاز اور عز و وقار کو ماند کرنے میں ناکام رہا ہے، قول کی پاسداری، سخاوت اور بہادری کی رندوں کی اخلاقی اقدار، اب ضرب المثل بن گئی ہیں۔ اسی لئے "رند قول"، "رندی سخاوت"، "رندی رحم" (رندی تلوار) کے مقولے زدِ خاص و عام ہیں۔

ان اختتامی تاثرات و کلمات کے بعد ہم عظیم زندہ جاوید انی اور حیات پرور طاقتور بلوچ حکمران چاکر کو ادبی طور پر وداع کہتے ہیں اور آخر میں ایک ممتاز بلوچ شاعر محمد خان گشکوری (۱۷۱۹ - ۱۷۸۹ عیسوی) کی اس بلوچی نظم کے ترجمے کے ساتھ اس جائزے کا اختتام کرتے ہیں۔ جس میں شاعر نے چاکر کے دور کے چند ممتاز امراء و شرفاء وغیرہ کے تذکرے کے علاوہ چاکر کے دورِ حکومت کے حالات و وقائع کی نہایت چابک دستی سے منظر کشی کی ہے۔

"میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، تخلیقات اور عجائبات کو یاد کرتا ہوں، بنی نوع انسان کتنی بڑی تعداد میں عجیب و غریب حالات میں ملک عدم کو سدھارتے جاتے ہیں۔ کوئی بھی دوبارہ اس عارضی دنیا کو لوٹ کر نہیں آتا، تمام حیوانی زندگی، اشجار اور پہاڑوں کو آخر کار فنا نصیب ہوگی۔

"پیغمبروں اور اولیا کے علاوہ عظیم شہنشاہ اپنے سنہری تخت و تاجوں کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ سکندر (قرآن شریف میں مذکورہ ذوالقرنین) کی شان و شوکت کو معہ اپنے لشکر جرار کے ساتھ"

"اور داریوش کو اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ، گرہن لگ گیا، اور وہ پرندے کی مانند دام (صیاد) میں گرفتار ہوگئے"

"میرے دل کی گہرائیوں سے ایک پرانی داستان ابھر آئی"

"مجھے ایام گزشتہ کی شخصیات و ہستیاں یاد آتی ہیں، میں چاکر اور میر ہمّل کی محفلوں کے گزشتہ ایک سو پچاس سال[1] پرانے واقعات کو یاد کرتا ہوں"

"رندوں نے (بلوچ تاریخ میں) شاندار کارنامے انجام دیئے۔ چاکر کے زیر سایہ فیاض ریحان اور رند شہسواروں نے شادی کی تقریب کی طرح مسرت و انبساط کے ساتھ زندگیاں گزاریں۔ مغنی ساز و سرود کی دلنواز و پرسوز لے پر نغمے گاتے تھے۔ وہ (رند) انہیں سونے اور نایاب گھوڑوں سے نوازتے تھے۔ ہزاروں دنبوں کے روزانہ بھی اور کباب بنائے جاتے تھے۔ رندوں کا لباس سفید زنگ کے کپڑے پر مشتمل تھا اصیل نسل کے حقیقی رند، سانگھڑ کے تیز رو گھوڑوں کی نوازش و بخشش کرتے تھے۔ چاکر کی گفتار بادلوں اور شیریں کی مانند گرجدار تھی۔ تمام بلوچ امرا اس

---

(۱) شاعر نے یہ نظم ۱۸۵۰ء میں کہی تھی۔

شیر کی طرح ان کی رہنمائی و رہبری کرتا
کے اشارے پر حرکت میں آتے تھے اور وہ

تھا۔ خود کو آراستہ و مزین کرتا تھا۔ بلوچوں کی
"میرہان، مینچ قبضہ کی تلوار سے
ناموری اور شہرت، بلند و بالا پہاڑیوں کی چوٹیوں سے گزر کر دراقصائے عالم بہ اپیل،
گئی ——— وہ مانند مرغ ہما[1] عروج و کمال تک پہنچے۔
"بہترین تیغ زن ریحان اپنی مشہور و معروف سیاہ رنگ کی گھوڑی کے
ساتھ اپنے دشمنوں کے دلوں میں آگ لگاتا تھا۔ الّن (اللہ داد) صوفی منش شہداد
کے ساتھ، نندو اپنی توسن انداز عقابی گھوڑی کے ساتھ، بیوزغ اپنے
غیض و غضب کے ساتھ، بیبرول مولا تغ اپنے چراغ کی طرح روشن چہرے
کے ساتھ، پر جلال جاڑو اپنے قول کی پاسداری میں شہرت کے ساتھ، طوفانی
جنگوں کا سرفروش اور جانباز میر بجار اور پیروز شاہ[2]، محمد[3]، اور در نایاب
نودبندغ، ہیبتان اور بیوزغ[4] اپنی تلواروں کے ساتھ ——— ان سب کو،
بیرطا قتور اور پرشکوہ نسل عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھتی تھی اور ان سے

---

(۱) ہما ایک تصوراتی پرندہ ہے، جس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ مافوق البشری قوتوں کا حامل ہے۔ یہ روایت عام ہے کہ جب وہ کسی شخص کے سر پر سے پرواز کرتے ہوئے گزرتا ہے تو وہ شخص بادشاہ بن جاتا ہے۔

(۲) پیروز شاہ میر بجار پژ رند کا والد تھا۔

(۳) محمد میر چاکر کا چچا زاد بھائی تھا اور اس کے اخلاف مجہدانی کے نام سے مشہور ہیں۔

(۴) بیوزغ، ہیبتان یا ہیتیان (ہیبت خان) کا والد تھا۔ جو میر حالی (بلیدی) قبیلے کا سردار تھا۔

محبت کرتی تھی۔ ان تمام ہستیوں پر میر چاکر کی والہانہ محبت اور شفقت کا سایہ تھا (مذکورہ شخصیتوں اور ہستیوں کے علاوہ) اس نسل کی کئی دیگر باصلاحیت شخصیتیں اور ہستیاں تھیں، تمام رند، افغانستان کے ترکوں کی طرح بہادر تھے۔ سب بہترین تیغ زن اور شیر کی مانند شجاع تھے۔ وہ مغرور و متکبر افراد کے سروں کو تن سے جدا کرتے تھے۔ وہ (رند) زرہ بکتر میں ڈھکے ہوتے تھے اور کاٹار، تیز لوک نیزہ اور خنجر کے ہتھیاروں سے مسلح و مزین ہوتے تھے۔ اپنے کندھوں پر مہلک بھاری کمان، تیر ہائے سوزان اور خراسانی تلوار آویزاں رکھتے تھے۔ مست ہاتھی کی طرح میر (چاکر) کی فوج دندناتی پھرتی تھی اور پورے خطۂ ارض کو مست سمندری موجوں اور طوفانی ندیوں کے سیلاب کی مانند، روندتی چلی جاتی تھی۔

"اور وہ علاقوں پر اتنی سرعت و تیزی کے ساتھ چھا گئے، جیسا کہ سفیدی مائل بادل کسی قطعۂ زمین پر چھا جاتے ہیں"

"(ان کے اثر و نفوذ کا دائرہ) لسبیلہ سے لے کر ملتان شہر تک پھیلا ہوا تھا"

"سانگھڑ، کچھی اور سلیمان کا سلسلۂ کوہ، سبی کا تخت و تاج اور خطہ ہائے خراسان (قلات اور کوئٹہ کا مرکزی سطح مرتفع) (جو کہ ان کے دائرہ اثر میں شامل تھے) تمام علاقوں کو قبائل کے درمیان ان کی طاقت اور شمشیر زنوں کی تعداد کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا۔ چشموں کے آب رواں اور سیلابی ندیوں سے زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ ہر صبح شکاری جتھے شکار کے مزے لوٹتے تھے عالی حسب نسب کے طاقتور رند، مسرت و شادمانی کے جشن منا کر عیش اڑاتے تھے"

"(بدقسمتی سے) ان کی صفوں میں انتشار و انحطاط اور حرص و آز کا

شیطانی طوفان بپا ہوا، قادر مطلق کی مرضی و منشا سے پوری نسل کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور وہ خطۂ ارض پر اولوں کی طرح بکھر گئے۔ انہوں نے گھمن گرج کے ساتھ دریائے چناب کی جانب پیش قدمی کی تھی۔ اس کے شہسواروں کا گرد و غبار دریائے راوی کے اس پار پہنچ گیا تھا اور بے باکی اور بے جگری سے پنجاب اور جودھپور کے علاقوں کے درمیان چہل قدمی کیا کرتے تھے۔"

"(اور) وہ وحشی ہرنوں کی مانند کلیلیں بھرتے ہوئے ادھر سے ادھر بھٹکتے رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنے مرز بوم اور ایوانوں کو تیاگ دیا ———— اور اسی روز ہی اپنے ملک سے ہاتھ دھو بیٹھے جب میر ہاتان قتل ہو گیا اور ایک دفعہ متحد و متفق نسل بے لگام ہو گئی۔"

"محمد خان اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ رندوں کے اثر و نفوذ اور اتحاد کا شیرازہ اسی روز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، جب انہوں نے ملتان کو فتح کر لیا۔"

---

(۱) "یوم ملتان کی" بد دعا بلوچوں کے تمام طبقوں میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے بلوچوں نے شہنشاہ شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں ملتان کو فتح کرنے کے بعد اسے لوٹ مار کر کے تاخت و تاراج اور تباہ و برباد کیا۔ اس کے تمام اہم مراکز میں خوب غارت گری اور لوٹ مار مچا رکھی تھی (ملاحظہ ہو تاریخ شیر شاہی) ملتان کا ایک ضعیف اور عمر رسیدہ بزرگ اور صوفی، بلوچوں کے قائدین کے پاس آیا اور انہیں باقی ماندہ آبادی کو تہ تیغ کرنے سے باز رکھنے کے لئے ان سے رحم و کرم کی درخواست کی۔ لیکن بلوچ رہنماؤں نے اس سے قطعی انکار کیا۔ اس بزرگ نے عالم مایوسی میں ان سے یوں خطاب کیا "تم بلوچ ایک طلائی ہار کی مانند ہو، مگر اب میری تسبیح کے دانوں

کی طرح بکھر کر عدم اتحاد کا شکار ہو جاؤ گے۔" بلوچی روایت کے مطابق اس بزرگ سید نے اپنی تسبیح کے دھاگے کو توڑ کر تسبیح کے دانوں کو زمین پر بکھیر دیا ——— اور آج تک یہی تصور کیا جاتا ہے کہ اس بددعا کے زیر اثر، بلوچ نفاق، مصائب، آلام، بدبختی اور خواری کا شکار ہو گئے ہیں۔

(ختم شد)

ہماری چند اہم مطبوعات

○ بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی	مرحوم میر گل خان نصیر ملک الشعراء
○ بلوچستان ماقبل تاریخ	ملک محمد سعید دہوار
○ شب چراگ	بشیر بلوچ
○ بلوچی گرامر (اردو میں)	آغا میر نصیر خان احمدزئی
○ بلوچی کارگونگ	آغا میر نصیر خان احمدزئی
○ بلوچی گرامر (انگریزی میں)	آغا میر نصیر خان احمدزئی
○ بلوچی عشقیہ شاعری	مرحوم میر گل خان نصیر ملک الشعراء
○ بلوچی رزمیہ شاعری	مرحوم میر گل خان نصیر ملک الشعراء
○ تبل وگاوار	غوث بخش صابر
○ توکلی مست	مرحوم میر مٹھا خان مری
○ رچگیں لال	محمد یوسف گچکی
○ تاریخ بلوچستان	لالہ ہتو رام
○ پرنگ	مرحوم میر گل خان نصیر ملک الشعراء
○ گاریں گوہر	مرحوم ڈاکٹر محمد حیات مری

بلوچی اکیڈمی ، کوئٹہ